نظام مرجعیت
شہیدین کی نظر میں

مقالات

شہیدین راہ حق:

حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ

حضرت آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

نام کتاب: نظام مرجعیت شہیدین کی نظر میں

مولف: حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ

حضرت آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین: سید رضی جعفر نقوی

ایم اے انصاری

کمپوزنگ: انس کمیونیکیشن 0300-4271066

ناشر: معراج کمپنی لاہور

پیشکش وتعاون: باب العلم دار التحقیق (فروغ ایمان ٹرسٹ) کراچی

زیرِ اہتمام: ابوظہیر

ملنے کا پتہ

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

0333-5234311

فہرست

عَرضِ ناشر

ابتدا ہے اپنے رب تعالیٰ کے نام سے جو حقیقت میں عبادت کے لائق ہے درود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر کہ جن پر خدا اور اس کے فرشتے بھی درود بھیجتے ہیں، اور سلام ہے ان کی اولاد پر جو ہماری رہنما اور وصی ہیں۔

آج ہمیں اسلام سے وابستگی اور اسلام سے آگاہی کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ جس طرح اسلام اور اس کا رہنما نظام سمجھنا ضروری ہے جب تک ہم اس رہنما نظام کو سمجھ نہیں لیں گے تب تک ہم کوئی تبدیلی لانے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔

معراج کمپنی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے قیام کے دن سے آج تک منفرد کام سرانجام دیئے ہیں، جناب سید العلما، آغا رہبر اور دیگر اکابرین کے آثار وافکار پر کام کیا اور ان بزرگانِ دین کی کتب کو جمع کر کے اشاعت کے زیور سے آراستہ کیا، اور اب شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کے افکار وآثار کو جمع وتدوین کا بیڑا اٹھایا ہے،

پیام اسلامک سنٹر کراچی کے مہتم محترم جناب سید فدا حسین رضوی نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ جناب شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کے گراں قدر کتب میں سے اس وقت کوئی کتاب بھی پاکستان میں دستیاب نہیں ہے جس سے محبان شہید باقر الصدر بہت افسردہ ہیں، نا صرف توجہ دلائی بلکہ کتب بھی مہیا کیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ ساری کاوش

جناب سید فدا حسین رضوی صاحب کی ہے تو بے جا نہ ہوگا ادارہ ان کا انتہائی ممنون ومشکور ہے اوران کے لئے دعا گو ہے۔اللہ ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے۔

مذکورہ کتاب دراصل شہید مطہری رحمۃ اللہ علیہ اور آقائے باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کے مقالات ہیں موضوع کے اعتبار کے ان کو ایک ہی جگہ جمع کیا گیا ہے تا کہ تشنہ گان علم کو الگ الگ تلاش کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔

اس کتاب کی اشاعت کے لئے باب العلم دارالتحقیق (فروغ ایمان ٹرسٹ) کراچی کے رئیس جناب سید شہنشاہ حسین نقوی مدظلہ العالی نے مالی تعاون پیش فرمایا ہے اللہ رب العزت ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے اوران کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

ادارہ ان تمام افراد کا انتہائی ممنون ومشکور ہے جنہوں نے شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کے کتب کی فراہمی میں مقدور بھر کاوش وسعی انجام دی۔

اگر کسی کے پاس شہید باقر الصدر کی کوئی تصنیف موجود ہے تو ازراہ کرم ہمیں ارسال فرمادیں تا کہ اس کو شائع کیا جا سکے اور آپ اس کار خیر میں ہمارے رفیق کار ہوں اور دنیا اورآخرت کی منازل میں ترقی کا سبب بن جائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

مرجعیت مصدرِ میمی یا اسمِ مکان ہے، مادہ ''رجع'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی لوٹنے کی جگہ اور مقامِ رجوع ہے۔

مرجعیت کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً

مرجعیتِ طبیعی۔

ہر چیز یا مادہ اپنی موجودہ شکل وصورت کھو جانے کے بعد اپنی پہلی اصل حالت کی جانب رجوع کرتا ہے جیسا کہ معروف مقولہ ہے کہ ''**کل شیء یرجع الی الصلہ**''، یعنی ہر شے اپنی اصل کی طرف پلٹتی ہے۔ اس مرجعیت کو مرجعیتِ طبیعی کہا جاتا ہے۔ مرجعیت کی دوسری صورت

مرجعیتِ عقلی ہے۔

یعنی ہر معلول موجود اپنی علتِ ایجادی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسے مرجعیتِ عقلی اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہر معلول کا اپنی علت کی جانب پلٹنا ایک عقلی حکم ہے۔ ہر غیر مستقل اور نیازمند و ناقص موجود اس مرکز کی طرف رجوع کرتا ہے جہاں سے اس کے نقص کا ازالہ ہوتا اور نیاز پوری ہوتی ہے۔ اسے مرجعیتِ فطری کہتے ہیں۔ جیسے جاہل کا عالم کی طرف رجوع کرنا ہے، مریض کا طبیب سے رجوع کرنا، ضعیف وناتواں کا قوی وقدرت مند

کی جانب رجوع کرنا۔

مرجعیت کی ایک اور صورت کسی صاحبِ اختیار ہستی یا کسی ادارے کی جانب سے کسی فرد یا گروہ کو مرجع قرار دیا جانا ہے۔اس مرجعیت کو

مرجعیتِ قانونی وقراردادی

کہتے ہیں۔سربراہانِ مملکت یا اداروں کے رؤسا کی مرجعیت ان کی ذاتی مرجعیت نہیں ہوتی بلکہ ان کا انتخاب کرنے کے بعد کوئی اور انہیں یہ مرجعیت سونپتا ہے، انہیں یہ منصب عطا کرتا ہے۔

قرآنِ کریم میں 53 مقامات پر ہر شے کے پلٹنے کا مقام اور تمام خلائق کا مرجع خداوند عالم کو قرار دیا گیا ہے۔طبیعی،فطری،قانونی مرجعیت کے ساتھ ساتھ ذاتی طور پر بھی مرجعیتِ تامہ صرف اور صرف خداوند تعالیٰ کو حاصل ہے۔ چنانچہ مخلوقات میں سے کوئی فرد اور کوئی ادارہ ذاتی طور پر اس وقت تک مرجعیت کا حامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس منصب کے لئے خداوند متعال کی جانب سے منصوب نہ ہو۔ چنانچہ اذنِ خدا کے بغیر خود کو مرجع کہنے والا قرآن کی اصطلاح میں طاغوت ہے۔

اللہ جل سبحانہ نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بارہ جانشینوں کو امتِ اسلامیہ کے مرجع اور جائے پناہ کے طور پر منتخب کیا ہے۔ان مقدس ہستیوں نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں اقتضائے وقت اور احتیاجات کی صورت میں خود اپنے نمائندوں اور نائبین کو معین کیا۔نیز ایسے فرمودات بھی ارشاد فرمائے جن میں اس منصب کے حق دار ہو سکنے والوں کی صفات بیان کی گئیں اور اس طرح اپنے ماننے والوں کو ہدایت کر گئے کہ ہمارے دورِ غیبت میں جن افراد میں یہ خصوصیات موجود ہوں وہ ہماری نمائندگی اور امت کی مرجعیت کے حقدار ہو سکتے ہیں۔

جب مرجع کا تعین وتقرر خدا کے خاص نمائندوں اور معصومینؑ کی جانب سے براہِ راست ہو اور معصوم واضح اشارہ کر کے یا نام لے کر مرجع کا تعارف کرائے تو وہاں نہ کوئی اس شخص کے انتخاب کے بارے میں اعتراض کرسکتا ہے،نہ اس کے اختیارات کے بارے

میں مختلف آرا ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب معصوم براہِ راست مرجع کے تعین سے معذور ہوئے جیسے امامِ زمانہؑ کے نوابینِ اربعہ کے بعد کی صورتِ حال تو ایسے حالات میں مرجع کا تعین بھی اور اس کے اختیارات کی حدود بھی محلِ نظر ہو گئیں۔

غیبت کبریٰ کے زمانے میں مرجعیت کے بارے میں دو مسئلے مورد بحث رہے ہیں۔

ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر بیک وقت کئی ایک فقیہ و مجتہد جامع الشرائط موجود ہوں تو کیا ان میں سے ہر ایک مقامِ مرجعیت پر فائز ہوگا، یا ان میں سے کسی ایک کو مرجعیت حاصل ہوگی، بقیہ اس منصب پر فائز نہ ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ کیا مکتبِ تشیع کے تمام مسائل کے حل و فیصل کا اختیار کسی ایک مجتہد کو حاصل ہوگا یا تمام ہی فقہا کو ان امور میں دخل کا حق حاصل ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بعض نے اس حدیث کا سہارا لیا ہے کہ:

''جب معصوم سے دریافت کیا گیا کہ کیا ایک زمانے میں دو امامؑ ہو سکتے ہیں؟ تو معصوم نے فرمایا ہاں! لیکن اس صورت میں جب کہ ان میں سے ایک ساکت رہے۔''

نیز امام حسین علیہ السلام کے بارے میں معروف ہے کہ آپؑ نے امام حسنؑ کے دورِ امامت میں اپنی صوابدید پر کوئی معاشرتی و سیاسی قدم نہ اٹھایا۔

لہٰذا جب اجتماعی و سیاسی امور میں بیک وقت دو معصوم فیصلے نہیں کر سکتے تو کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں دو غیر معصوم قیادت و زعامت امت میں مشغول ہوں۔

ایک سے زیادہ مرجع ہونے کی صورت میں نزاع اور تصادم کا امکان رہے گا۔ ظاہر ہے اختلافِ رائے کی صورت میں ان میں سے ایک کا فیصلہ درست نہ ہوگا۔ اور اگر اختلافِ رائے اور نزاع کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تب بھی فیصلوں میں تاخیر اور رکاوٹ بہرحال پیش آئے گی۔ لہٰذا تعددِ مرجعیت کا جواز نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ہی شرع میں

اس کی کوئی مثال موجود ہے۔

لیکن اگر مرجع کے علاوہ دوسرے فقیہ کی جانب محض مسائل فقہیہ جاننے کے لئے رجوع کیا جائے تو اس صورت میں کوئی اشکال نہیں۔

دوسرا مورد بحث مسئلہ مجتہد کے اختیارات کا ہے۔یعنی بعض کا کہنا ہے کہ وہ تمام اختیارات جو امامِ معصومؑ کو حاصل ہوتے ہیں دورِ غیبت کبریٰ میں وہ سب کے سب مجتہد جامع الشرائط کو حاصل ہوں گے۔ جب کہ دوسرے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نہیں! مجتہد جامع الشرائط کو زمانۂ غیبت معصوم میں معصوم کے بعض اختیارات حاصل ہوں گے تمام نہیں۔ بہرحال طویل تاریخ کے دوران اس سوال پر کافی بحث وتمحیص ہوئی ہے۔

اختیارات کے ضمن میں یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ کیا مجتہد جامع الشرائط کو عوام سے حقوقِ شرعیہ وصول کر کے انہیں خرچ کرنے کا اختیار حاصل ہے؟

یہ سوال طویل عرصے ہی سے متنازع رہا ہے۔غیبت کبریٰ کے ابتدائی ایام میں اس مسئلہ کے بارے میں اس قدر شبہات تھے کہ بعض مجتہدین نے ان اموال کو زمین میں دفن کر دینے کا فتویٰ صادر کیا۔بعض نے لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ ان اموال کو اپنے ہی پاس امانت کے طور پر رکھیں اور بعض فقہا نے اسے محض چند مدوں میں صرف کرنے کی اجازت دی۔

انہی متنازع مسائل میں سے ایک زمانۂ غیبت میں نمازِ جمعہ کا مسئلہ ہے۔بعض اسے عدم حضورِ امامؑ میں بھی واجب سمجھتے ہیں، بعض مستحب اور بعض حرام اور بعض احتیاط کی نیت سے پڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔اسی طرح عیدین کی نمازِ جماعت کے بارے میں بھی ہے کہ آیا وہ امامؑ کی غیر موجودگی میں جائز ہے یا نہیں، یا اسے فرادیٰ پڑھنا چاہئے؟ نیز جنگ و جہاد کی ابتدا کے سلسلے میں بھی اختلافِ رائے ہے کہ آیا مجتہد حکمِ جہاد دے سکتا ہے یا نہیں؟ نیز دورِ غیبت میں مجتہد کو حق حکومت حاصل ہے یا نہیں؟ وغیرہ۔

لہٰذا واضح ہوا کہ مرجع کے اختیارات کے بارے میں بحث قدیم ابحاث میں سے ہے۔ دورِ غیبت کے کچھ عرصے بعد تک کیونکہ اتفاقاً مرجعیت شخصِ واحد ہی میں منحصر

رہی تھی، ایک ہی فرد مرجع ہوتا تھا اس لئے ان اختلافات کے منفی اثرات بہت کم مرتب ہوتے تھے۔ لیکن جب فقہا و اعلام کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ہر فقیہ جامع الشرائط کو مرجع تسلیم کرنے کا رجحان بڑھا تو اس صورتِ حال کے نتیجے میں مرجع کے اختیارات کے بارے میں اختلاف کھل کر سامنے آیا۔ جس کی وجہ سے ملت تشیع کو بہت سے دینی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس خلل و بدنظمی کے باوجود مرجعیت کے تقدس کی حفاظت کے لئے اور اس نظام کی افادیت اور دین میں اس کی اہمیت کے پیش نظر دین کے لئے دل سوز افراد اور علما مصلحین ان خرابیوں کا برسر عام اظہار نہ کرتے تھے اور یہ خامیاں یوں ہی اپنی جگہ باقی رہتی تھیں لیکن اس سکوت کو عصر حاضر کے دو عظیم دینی مفکرین نے توڑا اور اپنی شخصیت اور حیثیت کو داؤ پر لگا کر مرجعیت کے نظام میں موجود خامیوں کو دور کرنے کی غرض سے ایک صالح نظامِ مرجعیت کے قیام کے لئے تجاویز پیش کیں۔ زیرِ نظر کتاب شہید آیت اللہ سید محمد باقر الصدرؒ (نجف اشرف) اور شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ (قم المقدس) کے دو مقالات پر مشتمل ہے جن میں انہوں نے نظامِ مرجعیت کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے ڈھانچہ کی اصلاح کی تجاویز پیش کی ہیں۔

مذکورہ مقالات اس دعا کے ساتھ ہدیۂ قارئین ہیں کہ خداوند متعال ان شہیدین کے بلند درجات کو انتہائی بلند فرمائے اور ان کے اہداف اور آرزوؤں کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

پہلا مقالہ

﴿مرجعیت صالحہ﴾

شہید آیت اللہ العظمیٰ

سید محمد باقر الصدر رضوان اللہ تعالی علیہ

حضرت آقائے سید باقر الصدر شہید رحمۃ اللہ علیہ

کے نقطۂ نظر سے

''صالح مرجعیت'' کا منصوبہ

حضرت آقائے سید محمد باقر الصدر شہید علیہ الرحمۃ نے بیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں دینی مرجعیت و زعامت کے ارتقا کے لئے ایک منفرد منصوبہ پیش کیا تھا جس کا ذکر وہ ''صالح مرجعیت' کے نام سے کیا کرتے تھے۔

آپ کا یہ منصوبہ بھی اس فکری بیداری اور خداداد ذہنی صلاحیت کی عکاسی کرتا ہے جو حضرت آقائے باقر الصدر کی پوری زندگی میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ اگرچہ آپ کی زندگی خود بہت ہی مختصر تھی۔

آپ نے اس منصوبے میں دو اہم بنیادوں کو ملحوظ رکھا تھا:

[ا] شیعوں کی مرجعیت و زعامت، جو تاریخ کے ایک انتہائی طویل دور پر محیط ہے اس کی عمومی روش کا، حضرت آقائے باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ نے بھرپور مطالعہ کیا اور بہت باریک بینی سے اس بات کا جائزہ لیا کہ امت کے درمیان اس کی کیا حیثیت ہے، اور کس طرح اپنے منہج کے اعتبار سے وہ تقلیدی بن جانے کے سبب معاشرے پر بھرپور

طریقے سے اثر انداز ہونے سے قاصر ہو چکی ہے۔ جب کہ اسلامی معاشرہ اسلامی اقدار سے بہت زیادہ منحرف بھی ہو چکا ہے اور غیر اسلامی باتیں، بہت زیادہ اس پر اثر انداز بھی ہو چکی ہیں!!

[۲] آپ کے متجسس ذہن نے اسلامی دنیا کی حقیقی صورت حال کا ادراک بھی کیا اور اس کی مشکلات کا حل بھی سوچا۔ کیونکہ آپ کا ضمیر و وجدان اس بات کو شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ معاشرے کو اسلامی فکر و عمل کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے کچھ بنیادی تبدیلیاں انتہائی ضروری ہیں اور یہ کام مرحلہ وار ہونا چاہئے، جس کے ذریعہ ہمہ گیر طریقے سے تبدیلی بھی آئی جائے اور مشکلات کا علاج بھی ہوتا رہے۔

چنانچہ آپ نے ''مرجعیتِ صالحہ'' کا جو منصوبہ پیش کیا اس کے جملوں اور فقروں پر غور کرنے سے ان دونوں مذکورہ بالا باتوں کی قدر و قیمت بالکل واضح ہو جاتی ہے اور یہ امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم ملاحظہ کر سکیں کہ آپ نے ''مرجعیت و زعامت'' کے بارے میں جو منصوبہ پیش کیا ہے اس کے مقاصد اور وسائل خود اسی منصوبے کے اندر پنہاں ہیں تا کہ کسی کو یہ فکر نہ کرنی پڑے کہ اتنے اہم مقاصد کے لئے وسائل کیسے فراہم ہوں گے؟

مرجعیتِ صالحہ کے مقاصد

حضرت آقائے باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ نے ''مرجعیتِ صالحہ'' کے لئے پانچ مقاصد مقرر کئے ہیں:

[۱] مسلمانوں کے درمیان جس قدر ممکن ہو وسیع پیمانے پر اسلامی احکام کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے اور ہر فرد کی اس طرح دینی تربیت کی جائے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی میں ان احکام کی پوری پابندی کرنے لگے۔

[۲] قوم کے اندر اسلامی مفاہیم پر مشتمل ایک ایسی فکری بیداری پیدا کی جائے جو ایک بنیادی فکر کے طور پر اس بات پر زور دے کہ اسلام ایک ایسا کامل نظام ہے جو زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پر محیط ہے۔ اور اس بات کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے

تمام ممکنہ وسائل کو کام میں لایا جائے۔

[۳] تحریک کو اسلام کے مطابق بنانے کے لئے جن اسلامی افکار کی ضرورت ہے ان کے اسباب فراہم کئے جائیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقتصادی واجتماعی موضوعات پر دروس اور اسلامی مباحث کا آغاز کیا جائے، اسلام اور دیگر اجتماعی مذاہب کے افکار کا موازنہ ومقابلہ کیا جائے اور فقہ اسلامی کے دائرے کو اتنا وسیع کیا جائے کہ اس کے قوانین زندگی کے ہر پہلو کا کاملاً احاطہ کرسکیں اور پورے حوزۂ علمیہ کے اندر اس اہم فریضے کی گویا روح پھونک دی جائے۔

[۴] اسلامی تحریک کی بھرپور نگرانی کی جائے اور عالم اسلام کے اندر جہاں جہاں اسلامی تحریک کے فروغ کے لئے لوگ کام کر رہے ہیں ان پر نظر رکھی جائے تا کہ جو کام صحیح طریقے سے اختتام پذیر ہو رہے ہیں ان کی تائید اور مدد کی جائے اور جہاں کوتاہیاں دکھائی دیں ان کی اصلاح کی جائے۔

[۵] مرجع وقت سے لے کر نچلی سطح تک کے وہ تمام علمائے کرام جو اپنے اپنے دائرے میں قوم کی رہنمائی کر رہے ہیں، قومی مفاد کے مطابق کام کر رہے ہیں اور لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان سب کے بین الاقوامی سطح پر مراکز قائم کیے جائیں، ان کی خبر گیری کی جائے اور اسلام کے لئے کام کرنے والوں کو ایک دائرے میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت آقائے سید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ نے ان مذکورہ بالا مقاصد کی آرائش وزیبائش میں اپنی فکری جولانیوں کو اچھی طرح مہمیز کیا اور ان سب کی بنیادوں کو باہمی طور پر ہم آہنگ کر دیا۔ اس سے قبل آپ اپنے سیاسی واجتماعی منصوبے کو ''حزب اسلامی'' نامی تنظیم کی شکل میں جاری بھی کر چکے تھے جس کے لئے آپ نے ایسا ہمہ گیر دستور عطا کیا جو اسلام کے ''دستورِ فکر و عمل'' کی روشنی پر برقرار رہتے ہوئے معاشرے کی ہمہ گیر تبدیلیوں کو اپنے اندر سمو سکے اور یہ بات اس منصوبے کے پہلے اور دوسرے نکتہ میں بالکل واضح طور سے نظر آتی ہے۔

آقائے موصوف نے ''صالح مرجعیت'' کے لئے جو پانچ مقاصد مقرر کئے ہیں ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل دو اہداف کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

[۱] اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر لوگوں کے فکر وعمل میں تبدیلی لائے جائے۔

[۲] ''مرجعیت وزعامت'' کو چاہئے کہ مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی کا فریضہ انجام دے اور معاشرے کے اجتماعی و ثقافتی معاملات میں عملی طور سے موجود نظر آئے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر اس طویل جدائی کو ختم کیا جاسکتا ہے جو مرجعیت اور معاشرتی معاملات کے درمیان عرصہ سے چلی آرہی ہے۔

یہ اہداف و مقاصد جن کو آقائے صدر نے مرتب فرمایا، اس ماحول کی عکاسی بھی کرتے ہیں جن میں آپ زندگی گزار رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اسلامی دائرے کو بھی اہمیت دی اور ان گھٹاٹوپ اندھیروں کا بھی ادراک کیا جو امت اسلامیہ کے وجود ہی کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اسی شعور وادراک کی روشنی میں آپ نے ''صالح مرجعیت'' کے اغراض و مقاصد معین کئے۔ البتہ آپ نے ان اہداف و مقاصد کے دائرے کو اتنا وسیع بھی نہیں کیا کہ وہ بین الاقوامی معاملات اور عالمی حالات پر اثر انداز ہونے لگیں، کیونکہ اس وقت تک ''اسلامی ریاست'' کا تجربہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا تھا، بلکہ اس وقت کے حالات تو اس کی نشاندہی بھی نہیں کر رہے تھے کہ کوئی بڑی سیاسی تبدیلی آنے والی ہے اور وہ سخت حالات جنہوں نے آپ کی ذاتی زندگی کو اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور حوزۂ علمیہ پر جس قسم کی فضا چھائی ہوئی تھی وہ بھی اس منصوبے سے زیادہ کسی اور بات کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔

اگر ان مذکورہ مقاصد میں سے ایک ایک مقصد پر اچھی طرح غور کیا جائے تو آسانی سے پتہ چل جاتا ہے کہ آپ نے جس سیاسی وسماجی ماحول میں زندگی گزاری اس کے

اور آپ کے درمیان ارتباط کا عامل کیا تھا؟

مثلاً پہلا مقصد آپ نے یہ بیان کیا ہے کہ

''مسلمانوں کے درمیان جس حد تک ممکن ہو اسلامی احکام کی نشر واشاعت کی جائے اور ایک ایک فرد کی اسلامی تربیت کی جائے۔''

یہ مقصد خود ہی واضح کر دیتا ہے کہ آقائے باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ عام معاشرتی فضا پر نظر رکھتے تھے، صرف عراق میں ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک پر آپ کی نظر تھی کیونکہ مسلمان ملکوں میں دین سے انحراف کے نمونے بالکل واضح اور اعلانیہ طور سے نظر آ رہے تھے اور وہ مومنین جو اسلامی روش اور اسلامی افکار کے پابند ہیں وہ دوسروں کی بہ نسبت بہت قلیل تعداد میں نظر آتے تھے۔ اور جن مقامات پر اسلامی احکام کی پابندی کی صورتِ حال بہتر بھی دکھائی دیتی تھی تو وہاں بھی زیادہ تر رسم و رواج میں جکڑی ہوئی مذہبی پابندی رائج تھی جس کا سرچشمہ پر جوش اسلامی بیداری نہیں تھی!!

اور جہاں تک دوسرے ہدف کا تعلق ہے تو اس کے تحت یہ کوشش کارفرما نظر آتی ہے کہ عالم اسلام میں جو ایک منفی روش نظر آتی ہے اس کا علاج کیا جائے۔ کیونکہ اس ناقص روش کو کہ اسلام محض عبادتوں کو انجام دینے کا حکم دیتا ہے، زندگی کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اسلام کے ساتھ زبردستی چسپاں کر دیا گیا ہے۔

یہ وہ منفی تصور ہے جسے اکثر حکومتوں نے مسلمانوں کے ذہن میں بٹھانے کی ماضی میں بھی کوشش کی ہے اور اب بھی کر رہی ہیں تاکہ دین و سیاست کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکے اور اس کے ذریعہ سے سیاسی اور قانونی معاملات کی انجام دہی اور تعلیم و ثقافت کے امور کو دین سے سیاسی اور قانونی معاملات کی انجام دہی اور تعلیم و ثقافت کے امور کو دین سے الگ کیا جا سکے۔ یوں نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلام کے لئے کام کرنا گویا خلافِ قانون کاموں میں حصہ لینا قرار پایا جس کی وجہ سے اسلام کے پر جوش نوجوانوں کو زندان

کی سختیاں بھی برداشت کرنا پڑیں اور انہیں تختہ دار پر بھی لٹکایا گیا جب کہ کفار و بے دین لوگوں کے گروہوں کو ان حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اس پروپیگنڈے نے اتنا گہرا اثر دکھایا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اسی ناقص نظریئے پر یقین کر بیٹھی۔ جب کہ یہ نظریہ اپنی جگہ خود غیر اسلامی ہے۔ لیکن اب صورت حال ایسی ہوگئی ہے کہ اصل اسلامی نظریے کو جو تمام معاملات کو شامل ہو، ذہنوں میں واپس لانے کے لئے بہت زیادہ فکری جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اور شاید اسی نقطۂ نظر نے بہت سے پابند دین مسلمانوں کی عملی توجیہات پر اثر ڈالا ہے۔ وہ اسلام کے دستورِ فکر و عمل پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرتے کہ اسلام کو زندگی کے معاملات سے دور کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ اسے کوئی خطرناک انحراف نہیں سمجھتے اور ان کی پوری توجہ اسلام کی مقرر کردہ عبادتوں کی انجام دہی کی طرف رہتی ہے۔

اور تیسرے مقصد میں حضرت آقائے باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس منفرد فکری اسلوب کی گہرائی اور تکمیل کی کوشش کی ہے جو آپ کی جاودانی تالیفات

''اقتصادنا''،

''فلسفتنا''

اور

''المدرسۃ الاسلامیہ''

میں دوسرے فکری مذاہب کے مقابلے پر نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان کتابوں میں آپ نے مارکسزم، سوشلزم اور سرمایہ داری جیسے فلسفی اور اقتصادی مذاہب پر بھرپور تنقید کی ہے اور علمی انداز سے ان مذاہب کی غلطیوں کو ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کا فارمولا بھی پیش کیا ہے۔

چنانچہ مرجعیتِ صالحہ کے اس تیسرے مقصد کے تحت آپ چاہتے تھے کہ شیعوں

کی مرجعیت وزعامت ان فکری مذاہب کے مقابلے پر ایک ہمہ گیر موقف اختیار کرے اور اس مسئلہ کی اہمیت کو پوری طرح ملحوظ رکھے، تا کہ اس فکری چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری ایک انفرادی کوشش کے بجائے مرجعیت وزعامت کے ادارے کی ذمہ داری بن جائے تا کہ وہ اسلامی افکار کو آگے بڑھاتے ہوئے اور فقہی تحقیقات کے دائرے کو وسیع کر کے اس کی طرف سبقت کر سکے۔ اسی صورت میں زندگی کے تمام مسائل کا حل اور مشکلات کا علاج ممکن ہو سکے گا اور اس بات کا یہ تقاضا ہے کہ علمی مراکز کے درمیان ثقافتی اور فکری سطح کو بلند کرنے کی از سرنو کوشش کی جائے۔

اور منصوبہ کے چوتھے مقصد میں آقائے صدر شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی تحریک کو بہت اہمیت دی ہے اور اس بات کو ضروری قرار دیا ہے کہ دینی مرجعیت وزعامت ان تمام اسلامی تحریکوں کا ساتھ دے جو عالم اسلام میں چل رہی ہیں۔ حالات بتا رہے ہیں کہ یہ ایک انتہائی اہم ضرورت ہے کیونکہ اسلامی تحریکیں مراجع کی تائید ونصرت سے بے نیاز ہو ہی نہیں سکتی ہیں اور مرجعیت وزعامت کو بھی ایک ایسے فعال ومتحرک ادارے کی ضرورت ہے جو پوری امت مسلمہ کے درمیان پھیلا ہوا ہو، جو اسلامی افکار کی نشر واشاعت کرے اور پورے معاشرے کو اسلام کے قالب میں ڈھالے!

یہ بات قرین قیاس نظر آتی ہے کہ آقائے باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کو عراق کی زندگی میں جو ذاتی تجربات پیش آئے اور جن کے دوران آپ نے اسلامی تحریک کی تاسیس کی اور اس کی کارکردگی کی نگرانی فرمائی، اسی کی روشنی میں مرجعیت کا یہ چوتھا مقصد قرار دیا ہو۔ کیونکہ آپ نے محسوس کیا کہ اسلامی معاملات کی انجام دہی میں اسلامی تحریک کا کتنا حصہ ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے تجربے کی روشنی میں یہ طے کیا کہ مرجع وقت کو ان تحریکوں کی پشت پناہی کرنی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کی پیچیدگیوں کے باوجود آپ برابر اس پر زور دیتے رہے۔

اور اس پہلو پر زور دینے سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ زندگی کو

اسلامی رخ سے سمجھنے کے لیے آپ کس قسم کی فکری تحریک کو ضروری سمجھتے تھے اور آپ کے نزدیک یہ بات نہایت ضروری تھی کہ دینی مرجعیت کے پاس تحریکی احساسات موجود ہوں تاکہ وہ تمام اسلامی پہلوؤں کا احاطہ کر سکے اور اس رخ پر کام کرنے والوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے۔

اور پانچویں مقصد حضرت آقائے سید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ نے مرجعیت کے لئے تحریکی کوششوں پر مزید زور دیا ہے تاکہ قوم کے اندر مرجعیت وزعامت کا جو مقصود و مدعا ہے اسے حاصل کیا جا سکے، چنانچہ آپ یہ کوشش فرماتے ہیں کہ ایک طویل زمانے سے جو گوشہ نشینی چلی آرہی ہے اسے ختم کیا جائے، کیونکہ اس گوشہ نشینی نے مرجع وقت کو قوم سے الگ کر رکھا ہے۔

آپ یہ چاہتے تھے کہ معاشرے کے اندر علمائے دین اور مرجعیت وزعامت کا جو تاریخی کردار ہونا چاہئے وہ واپس آجائے جس کے لئے آپ نے مرجع وقت اور عالم دین کو قومی قیادت کے منصب پر لانے کی کوشش کی تاکہ قوم کے عمومی مسائل و معاملات مرجع وقت کے پاس آجائیں، کیونکہ آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ امت کن حالات میں زندگی گزار رہی ہے اور اس کی مشکلات اور ضروریات کیا ہیں۔

حضرت آقائے سید محمد باقر الصدر الشہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقصد کو نہایت واضح طریقے سے بیان کیا ہے کیونکہ آپ نے جس زمانہ میں زندگی گزاری اس وقت مرجعیت، عام زندگی کے میدان سے دور ہو چکی تھی اور آپ نے یہ بھی ملاحظہ کیا کہ اس دوری کے سبب اجتماعی، ثقافتی اور سیاسی سطح پر یہ نتائج رونما ہوئے کہ اسلام سے منحرف طاقتوں نے اس میدان پر قابض ہو کر اسلام کو اس کے حقیقی منصب سے دور کر دیا۔ اس لئے آقائے باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ یہ چاہتے تھے کہ یہ گوشہ نشینی کی کیفیت ختم ہو تاکہ اسلام کی غربت کا دور ختم ہو سکے اور ان نقصانات سے بچا جا سکے جن سے پوری قوم دوچار ہے۔

یہ تھے وہ عمومی اسباب جن کی بنا پر آقائے باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ نے ''صالح مرجعیت''

کے لئے مذکورہ مقاصد کو معین کیا جو نتیجہ ہیں اس دور کے اجتماعی و سیاسی حالات کے گہرے تجزیئے اور گرانقدر تحریکی فہم و شعور کا۔ اور جو اس قدر ہمہ گیر اور پر اثر ہیں کہ ''مرجعیت و زعامت'' کے ادارے میں پائی جانے والی تمام کوتاہیوں کا سد باب کر سکتے ہیں!!

محمد حسین فضل اللہ

حضرت آقائے سید محمد باقر الصدر الشہید رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے

''مرجعیتِ صالحہ کے منصوبے کا اصل متن''

سب سے اہم بات جو ''مرجعیتِ صالحہ'' کو ممتاز قرار دیتی ہے وہ ان حقیقی اہداف کی تعمیر و تکمیل ہے جن کے حصول کی راہوں پر چلنا، اسلام کی خدمت کے لحاظ سے مرجعیت و زعامت پر واجب ہے۔ اور اس کے نزدیک ان اہداف کے حصول کی صورت بالکل واضح ہونی چاہئے اور اسی لحاظ سے وہ مرجعیت واضح طور سے بامقصد مرجعیت کہی جائے گی جو پورے شعور و ادراک کی حامل ہو اور ہمیشہ ان ہی اہداف کے لئے کام کرے۔ نہ یہ کہ اس کے تصرفات بے ربط ہوں ظنی تخمینی روح ان میں کام کر رہی ہو اور نو بہ نو پیش آنے والی جزئی ضروریات سے مجبور ہو کر کوئی قدم اٹھالے۔

اس بنا پر ''مرجعیتِ صالحہ'' کو یہ قدرت حصال ہوگی کہ وہ نئے سرے سے اسلام کی خدمت انجام دے اور جن مقامات تک اس کا اثر و نفوذ پھیلا ہوا ہو وہاں تک اسلام کے مفاد میں بہتر تبدیلی پیدا کرے۔

''صالح مرجعیت'' کے مقاصد

''مرجعیتِ صالحہ'' کے مقاصد اگر چہ ایک دوسرے سے مربوط وہم آہنگ ہوں گے اور ان سب میں ایک ہی ہمہ گیر روح کارفرما ہوگی تاہم ان مقاصد کو پانچ نکتوں میں قلمبند کیا جاسکتا ہے:

[۱] جس قدر زیادہ ممکن ہو مسلمانوں کے درمیان اسلامی احکام کی نشر و اشاعت کی جائے اور تمام افراد کو ایسی دینی تربیت دے دی جائے جو انہیں انفرادی زندگی میں اسلامی احکام کا پابند بنانے کی ضامن ہو۔

[۲] قوم کے درمیان وسیع پیمانے پر ایسا فکری شعور پیدا کر دیا جائے جو اسلام کے تمام اعلیٰ وارفع اور بیدار مفاہیم کو اپنے دائرے میں لے لےجس میں سیاسی مفہوم بھی شامل ہو۔ جو اس بات پر زور دے کہ ''اسلام ایک کامل نظام ہے جو زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے'' اور اس فکری شعور کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے تمام ممکنہ وسائل استعمال کئے جائیں۔

[۳] اسلامی تحریکوں کی جو فکری ضروریات ہیں انہیں پورا کیا جائے، اور اس مقصد کے لئے وافر پیمانے پر زندگی کے مختلف اجتماعی واقتصادی موضوعات پر اسلامی مباحث کا آغاز کیا جائے۔ نیز اسلام اور دوسرے اجتماعی مذاہب کے درمیان موازنہ کر کے اسلام کی عظمت کو ثابت کیا جائے۔ فقہ اسلامی کے دائرے کو اتنا وسیع کیا جائے کہ وہ زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کا قانون کے ذریعے سے بھرپور احاطہ کر سکے اور پورے علمی مرکز کو

اس اہم ترین فریضے کی انجام دہی پر آمادہ کیا جائے۔

[۴] اسلامی تحریکوں کی نگرانی کی جائے اور اس راہ میں کام کرنے والے حضرات عالم اسلام کے مختلف اطراف و جوانب میں جہاں جہاں دین کی خاطر خدمات انجام دے رہے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے، ان پر توجہ دی جائے تا کہ جو صحیح کام کر رہے ہیں ان کی تائید و نصرت کی جائے اور خامیوں کی اصلاح کی جائے۔

[۵] عالمی سطح پر مراکز قائم کئے جائیں جن میں مرجع اعلیٰ سے لے کر نچلی سطح تک کے تمام علمائے کرام قوم کی قیادت کے منصب پر فائز ہوں، امت کے مفاد کو قائم رکھیں، لوگوں کے مسائل میں دلچسپی لے کر انہیں حل کرنے کی کوشش کریں، قومی مفاد کا لحاظ رکھیں اور جو لوگ دین کے لئے کام کر رہے ہیں انہیں اپنے ساتھ لے کر قدم بڑھائیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مرجعیت و زعامت کے یہ مقاصد اگر چہ بالکل نمایاں ہیں اور ان ہی کی روشنی میں صالح مرجعیت کے خدو خال معین ہوتے ہیں جس کے ذریعے اس کی سیاست میں ایک ہمہ گیر تبدیلی آسکتی ہے۔ معاملات کی طرف اس کا نقطۂ نظر تبدیل ہوسکتا ہے اور قوم کے ساتھ اس کے معاملات رخ بدل سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ صرف ان مقاصد کو معین کر دینے اور واضح طور سے یہ سمجھ لینے سے کہ یہ مقاصد مرجعیتِ صالحہ کے لئے ممکن فوائد کو حاصل کرنے کے بڑی حد تک ضامن ہیں یہ سب نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان نتائج کے حصول کے لئے مرجع وقت کی صلاحیت و استعداد، اس کی فکری بیداری اور مقصد کی طرف توجہ کے ساتھ ساتھ ''مرجعیتِ صالحہ'' کے قیام سے پہلے کچھ ابتدائی امور کی انجام دہی بھی ضروری ہے اور ''مرجعیت کے اسلوب اور اس کی کارکردگی کے انداز'' میں بھی پیشرفت پیدا کرنا لازمی ہے۔

جہاں تک ''ابتدائی امور'' کی انجام دہی کا تعلق ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ:

اس ''مرجعیتِ صالحہ'' کے آغاز کے لئے جو اپنے کاندھوں پر مذکورہ بالا مقاصد کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو علمی مرکز کے اندر بھی اور قوم کے درمیان بھی ایک ایسے دستور اور

اساس کی ضرورت ہے جو ان مقاصد پر بھر پور یقین رکھے اور اسلام کی خدمت نیز مرجعیتِ صالحہ کی تشکیل میں فکری اور روحانی طور پر حصہ لے۔

کیونکہ جب تک ایسا دستور اور اساس وجود میں نہ آئے جو مرجع صالح کے افکار و نظریات سے ہم آہنگ ہو اور معاملات کو اس صالح شخصیت کی عطا کردہ تربیت کی روشنی میں دیکھے، اس وقت تک انفرادی حیثیت میں اس صالح مرجع کا وجود مرجعیتِ صالحہ کو ایجاد کرنے اور وسیع پیمانے پر اس کے مقاصد کے حصول کے سلسلے میں ناکافی ثابت ہوگا۔

اس بنا پر ہر وہ شخص جو مرجعیت و زعامت کے ادارے کو ترقی دے کر ''مرجعیتِ صالحہ کے ان ابتدائی امور'' کو انجام دے۔ کیونکہ ان امور کے انجام پذیر نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے بہت سے صالح علمائے کرام (اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود) جب مرجع وقت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ صورتِ حال کو تبدیل کرنے سے قاصر ہیں۔

کیونکہ وہ ''ابتدائی امور'' انجام ہی نہیں پائے ہوتے، نہ مرجعیت کے اعلیٰ ترین اہداف کا خاکہ ہی ان کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا اور نہ ایسی اساس جسے ان اہداف کی ضرورت پر یقین ہو۔

مرجعیت کے اسلوب و روش کا ارتقا

جہاں تک مرجعیت کے طرزِ اسلوب، اندازِ فکر اور عملی صورتِ حال کا تعلق ہے تو اس کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل اہداف ہونے چاہئیں:

[ا] ''مرجعیت و زعامت'' کے لئے ایک ایسا ادارہ بنایا جائے جو منصوبہ بندی اور نفاذ دونوں لحاظ سے باعمل ہو، اس میں بھرپور استعداد بھی ہو، کام کی مہارت بھی ہو، تقسیم کار کو بھی ملحوظ رکھا جائے اور یہ ادارہ مرجعیت و زعامت کے تمام پاکیزہ اور صالح اعمال کا مقرر و معین مقاصد کی روشنی میں احاطہ کرے۔

یہ ادارہ حقیقتاً باعمل ہو اور اس ''حاشیہ'' کی جگہ کام کرے جو ایک بے عمل قسم کا

ادارہ بن کر رہ گیا ہے۔ جس میں چند اشخاص اتفاقی طور سے اور اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے جمع ہو جاتے ہیں تا کہ کچھ وقتی قسم کی ضرورتوں کی تکمیل کر سکیں، ان کی ذہنیت بھی محدود ہوتی ہے اور ان کے سامنے کوئی واضح اور معین نصب العین بھی نہیں ہوتا۔

لہٰذا ''مرجعیتِ صالحہ'' کے لئے ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو متعدد کمیٹیوں پر مشتمل ہو جو رفتہ رفتہ ترقی کریں اور مرجعیت کے عمل کے تمام وسائل وامکانات کا احاطہ کر سکیں۔

اس سلسلہ میں ہم اعلیٰ نمونے اور بلند تر نصب العین کے طور پر مندرجہ ذیل کمیٹیوں کا تذکرہ کر سکتے ہیں جو اس قابل ہوں گی کہ ترقی وتکمیل کے مراحل طے کر کے ''مرجعیتِ صالحہ'' کے لئے ایک باعمل ادارے کی حیثیت اختیار کرلیں۔

[۱] ایسی کمیٹی یا کمیٹیاں جو مرکز علمی کے درسی نظام کو چلائیں۔ ان کمیٹیوں کا کام یہ ہوگا کہ درسِ خارج سے قبل جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اسے منظم کریں، درسِ خارج کی نگرانی کریں، نصابِ تعلیم مرتب کریں اور اس کے مطابق کتابیں تیار کریں تا کہ رفتہ رفتہ علمی مراکز کا درس اس بلند سطح تک پہنچ جائے کہ پورا حوزۂ علمیہ ''مرجعیتِ صالحہ'' کے مقاصد کے حصول میں حصہ لے سکے۔ یہ کمیٹی تمام طلبہ کے بارے میں یہ معلومات بھی رکھے کہ وہ کس خطۂ ارض سے تعلق رکھتے ہیں اور اس بات کی بھی کوشش کرے کہ خالی جگہوں کو پُر کیا جائے اور تعداد کو بڑھایا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ طالبانِ علم فیضیاب ہو سکیں۔

[۲] ''علمی تخلیقات کی کمیٹی''، جس کا فریضہ یہ ہوگا کہ ''فکری مباحث'' کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے علمی مراکز قائم کرے، حوزۂ علمیہ سے جو صالح افراد نکل رہے ہیں ان کا خیال کرے، ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ اسلام سے تعلق رکھنے والی عالمی فکر کی پیروی کرے، میگزین وغیرہ نکالنے کی بھرپور کوشش کرے۔ اس فکر میں رہے کہ باصلاحیت عناصر کو حوزۂ علمیہ کی طرف ترغیب دے، یا اگر وہ دسترس سے باہر ہوں تو ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

[۳] ''ایک یا کئی ایسی کمیٹیاں'' جو ان علمائے کرام کے حالات کی خبر

رکھیں جو متعدد علاقوں میں مصروفِ عمل ہیں، ان کے نام پتے اور وکالت نامے کی کاپی محفوظ رکھے، ان کی سیرت و کردار اور سلوک و روابط کی جستجو کرے۔ جہاں جہاں نقائص نظر آئیں ان کی اطلاع دے، ان کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ جو جگہیں خالی ہوں ان سے باخبر رہے اور ان لوگوں سے مطالبہ کرے کہ اپنی کارکردگی کا خلاصہ تحریری شکل میں برابر بھیجتے رہیں۔ یا جب مرجع طلب کرے تو پیش کریں۔

[۴] ''رابطہ کمیٹی'' جو اس بات کی کوشش کرے کہ جو علاقے علمی مرکز سے متصل نہیں ہیں ان سے بھی مرجعیت و زعامت کے روابط استوار رہیں۔ یہی کمیٹی اس بات کی بھی ذمہ داری ہوگی کہ تمام علاقوں کے اعداد و شمار جمع کرے، اس بات کی تحقیق کرے کہ ان علاقوں سے رابطے کے کیا امکانات ہیں۔ نیز یہ کمیٹی ان علاقوں کے لئے مرجع وقت کے نمائندے یا کسی اور حیثیت کی حامل شخصیت کے سفر کا اہتمام بھی کرے تا کہ علاقے کے حالات کا جائزہ لیا جا سکے اور جن علاقوں میں عالم دین کے استقبال کے لئے زمین ہموار ہو ان کی نشاندہی کرے اور وہاں مسلسل آمد و رفت رکھے۔

یہ بھی اسی کمیٹی کا کام ہوگا کہ عالم اسلام کے مختلف اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے علما و مفکرین کے ساتھ صحیح اور معقول حدود میں رابطہ رکھا جائے۔ ان کے پاس اپنی کتابیں بھیجی جائیں اور حج کے موسم جیسی مناسبتوں سے فائدہ اٹھا کر ان روابط کو مضبوط کیا جائے۔

[۵] ایک کمیٹی ایسی ہو جو اسلامی تحریکوں پر نظر رکھے اور دیکھے کہ عالمِ اسلام میں اس کے نمونے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں اور ہر نمونے کے ذریعے ایک فکر ایجاد کی جائے اور حسبِ ضرورت ان کی مدد بھی کی جائے، نصیحت بھی۔

[۶] ''مالیاتی کمیٹی'' جو تمام اموال کا حساب رکھے، ان کے موارد کا احاطہ کرے، مالیات کے سلسلے میں نمائندے مقرر کرے اور کوشش کرے کہ بیت المال کے وسائل میں فطری طور سے اضافہ ہوتا رہے۔ نیز یہ کمیٹی ان اخراجات کا بھی درست

طریقے سے اندراج کرے جو اس ادارے کو چلانے کے لئے ضروری ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ اس ادارے کا اتنا وسیع پیمانے پر پھیل جانا اس بات پر موقوف ہے کہ یہ ادارہ ایک طویل مدت تک ارتقائی مراحل طے کرتا رہے۔ یہ بات بالکل فطری ہے کہ یہ ادارہ شروع میں بالکل محدود ہوگا، اس میں کوئی حقیقی تخصص بھی نہیں ہوگا کہ کیونکہ مرجعیت کا دائرہ بہت محدود ہوگا اور وافر تجربہ بھی نہیں ہوا ہوگا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلسل عمل و تجربے ہی سے قابلیتوں اور صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور یہی چیز تخصص و ہمہ گیری میں ممد و معاون بنتی ہے۔

ابتدا میں بتایا گیا کہ مرجعیت کے پیشِ نظر متعدد اہداف ہونے چاہئیں جن میں پہلا ہدف ایک ایسے ادارے کی تشکیل ہے جو مختلف کمیٹیوں کے ذریعے مرجعیتِ صالحہ کے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اور دوسرا ہدف یہ ہے کہ:

''مرجعیت وزعامت'' کے لئے ایک ہمہ گیر اور حقیقی فضا پیدا کی جائے جو اسے ایسا مضبوط محور و مرکز بنادے جو ان تمام قوتوں کا سرچشمہ ہو جو مرجع وقت کے تمام نمائندوں اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان لوگوں کے اندر پائی جاتی ہیں جو مرجعیت سے ربط و نسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب یہ ''مرجعیتِ صالحہ'' بڑے بڑے اہداف کی تکمیل کے لئے قدم بڑھائے گی اور قوم کے اندر شعوری قسم کی عملی بیداری لانے کی سعی کرے گی تو پھر یہ بھی ضروری ہو جائے گا کہ اس کے اندر اثر و نفوذ کی زیادہ سے زیادہ قوت و صلاحیت ہو جس سے وہ فائدہ اٹھا سکے، اور بالآخر، تدریجاً ہی سہی، دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے نمائندوں پر یہ فرض عائد کرے کہ وہ ان ہی اہداف کے حصول کی طرف پیش قدمی کریں۔

اس وقت کی صورتِ حال تو یہ ہے کہ اگرچہ دنیا بھر کے شیعہ علمائے کرام عملی زندگی میں مرجع وقت سے رابطہ رکھتے ہیں لیکن یہ بات واضح طور سے محسوس کی جاسکتی ہے کہ اکثر اوقات یہ رابطہ محض ظاہری حیثیت کا حامل ہوتا ہے، کسی ٹھوس بنیاد پر قائم نہیں ہوتا اور اس کے ذریعے وہ مرکزیت پیدا نہیں ہوسکتی جو مقصود و مطلوب ہے۔

اور ان مسائل کا حل یہی ہے کہ مرجع وقت کے کاموں کی صورتِ حال میں بہتر تبدیلی لائی جائے، کیونکہ تاریخ کے صفحات پر مرجعیت کے کاموں کا جو انداز ثبت ہے وہ سب انفرادی عمل کے نہج پر نظر آتا ہے اور اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ تمام طاقتور شخصیتیں جن کا مرجع سے رابطہ تھا وہ تمام ذمہ داریوں اور اجتماعی کارکردگی میں مرجعیت کے ساتھ حقیقی مشارکت رکھتی تھیں اور اس کے موقف کے ساتھ بھرپور طریقے سے ہم آہنگ تھیں۔

لیکن اگر مرجع وقت اپنے کاموں کو ایسی مجلسِ عاملہ کے ذریعے سے انجام دے جو شیعہ علمائے کرام اور نمایاں دینی شخصیتوں پر مشتمل ہو اور خود مرجع کا تعلق بھی اسی مجلسِ عاملہ سے ہو تب وہ عمل وجود پذیر ہوسکتا ہے جسے مرجع کا ''موضوعی عمل'' کہا جائے۔

البتہ جہاں تک مرجع کی ذات وشخصیت کا تعلق ہے تو وہ چونکہ ''نائبِ امام'' کی سند رکھتا ہے اور یہ نیابت اس کی ذات ہی کو حاصل ہوگی نہ کہ مجلسِ عاملہ کو لیکن یہ منصب اسے اس بات سے نہیں روکتا کہ وہ اپنے لئے طریقِ کار کیسا بنائے؟ لیکن یہ طریقِ کار ان ہی حدود کی روشنی میں ہونا چاہئے جو مقاصد سے ہم آہنگ اور قومی مفاد کے مطابق ہوں۔

اور اگر طریقِ کار میں یہ ''موضوعیت'' آجائے تو مرجع وقت کے وہ معاملات جن کا تعلق اس کی مرجعیت سے ہے اس تاثر سے محفوظ ہوسکتے ہیں کہ یہ ایک شخصِ واحد کی مرضی کے آئینہ دار ہیں جس کے بہت دوررس اور ہمہ گیر نتائج سامنے آئیں گے۔ کیونکہ مرجع وقت کے تمام نمائندے یہ محسوس کریں گے کہ مرجعیت کے کاموں کی ذمہ داری میں وہ سب ایک دوسرے کے شریک وسہیم ہیں اور ''مرجعیتِ صالحہ'' کی جو تدبیر وسیاست مجلسِ عاملہ نے طے کی ہے وہ اس کے نفاذ میں حصہ دار ہیں۔

اور بعد میں یہ مجلسِ عاملہ ان کمیٹیوں کو بھی اپنے دائرے میں لے سکتی ہے جن پر ''مرجعیت'' کا پورا عملی ادارہ مشتمل ہوگا اور اس طرح وہ دونوں نکات آپس میں ہم آہنگ ہو جائیں گے جن کو ہم نے نمبر ایک اور نمبر دو کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

اب اگر کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ مرجع وقت (موجودہ کیفیت میں) جو

اپنے کاموں کو انفرادی حیثیت میں انجام دیتا ہے اس کے کئی عمدہ پہلو ہیں، مثلاً مسئلہ کی طرف فوری توجہ، کام کے محفوظ ہاتھوں میں ہونے کی ضمانت اور ایسے عناصر کی عدم مداخلت جو شعور کی پختگی نہ رکھتے ہوئے بھی مرجع وقت کے کاموں کی منصوبہ بندی میں حصہ لینے لگیں!!!

تو (جواب میں) ہم یہ کہیں گے کہ یہ تمام عمدہ پہلو بالکل واضح ہیں جن سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔لیکن ''مرجعیتِ موضوعیہ'' جس کے پاس تمام ضروری وسائل موجود ہوں اس کے امتیازات زیادہ بھی ہیں اور ان کی اہمیت بھی بہت ہے!!

وہ ''مرجعیت'' جو اپنے کاموں کو انفرادی حیثیت سے انجام دے اسے ہم ''مرجعیتِ ذاتیہ'' کہیں گے اور وہ مرجعیت جو اپنے کاموں کو مجلسِ عاملہ کے اشتراک کے ساتھ اجتماعی شکل میں انجام دے اسے ہم ''مرجعیتِ موضوعیہ'' کے نام سے یاد کریں گے۔ جس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ شرعی طور سے ''مرجع وقت'' کون ہے؟ اس کی تعین وتشخیص کے مسئلہ میں ''مرجعیتِ ذاتیہ'' اور ''مرجعیتِ موضوعیہ'' کا کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ مرجع وقت تو ہمیشہ وہی ہوگا جو نائبِ امام ہو، اور ''نائبِ امام'' اس عظیم المرتبت مجتہدِ عادل کو کہا جاتا ہے جو تمام مجتہدین سے زیادہ علم بھی رکھتا ہو اعلمِ وقت ہو اور نیابتِ امام کے تقاضوں سے باخبر بھی ہو۔

اور اس سے یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مرجع وقت چونکہ نائبِ امام ہوتا ہے اس لحاظ سے اس کی مرجعیت ہمشہ ذاتی ہی رہے گی، لیکن اپنے کاموں کی انجام دہی کے لئے مرجع وقت جو طریقِ کار اپنائے گا اس کے لحاظ سے اس کی مرجعیت کو ''مرجعیتِ ذاتیہ'' یا ''مرجعیتِ موضوعیہ'' کہا جائے گا۔

''مرجعیتِ صالحۃ'' کے لئے ایک طولانی مدت درکار ہے جس کی گنجائش عام طور سے کسی ایک فرد کی زندگی میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا کوئی ایسی عارضی ضمانت ضروری ہے کہ مرجعیت کا تسلسل ایسے صالح انسان میں برقرار رہے جو ''مرجعیتِ صالحۃ'' کے مقاصد کو تسلیم

کرتا ہوتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مرجعیت کسی ایسے شخص کی طرف منتقل ہو جائے جو مذکورہ بالا مقاصد کو تسلیم ہی نہ کرتا ہو۔ جس کے نتیجے میں یہ نظام درہم برہم ہو جائے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نئے مرجع کو یہ موقع دیا جائے کہ سابق مرجع وقت نے اپنی ذمہ داریوں کو جہاں تک پہنچایا ہے، نیا مرجع اسے وہیں سے آگے بڑھانے کی کوشش کرے، نہ یہ کہ اسے اپنا کام از سرِ نو شروع کرنا پڑے، ابتدا میں جن دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اسے بھی ان سے گزرنا پڑے اور گوناگوں مشکلیں برداشت کرنا پڑیں۔

سابق مرجع کے کاموں کے تسلسل کو برقرار رکھ کر مرجعیت کو یہ تحفظ فراہم کیا جائے کہ وہ ان مقاصد کے لئے کوششیں بھی جاری رکھے اور گوناگوں ''طویل المعیاد منصوبہ بندی بھی کرتی رہے۔ اور یہ کام ''مرجعیتِ موضوعیہ'' ہی کے ذریعہ سے انجام پذیر ہوسکتا ہے۔

کیونکہ ''مرجعیتِ موضوعیہ'' کے منصوبے میں صرف مرجع کی ذات ہی موجود نہ ہوگی بلکہ مرجع کی ذات کے ساتھ ساتھ وہ مجلسِ عاملہ بھی ہوگی جو اپنے ساتھ اس پورے ادارے کو ملالے گی (جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے) تاکہ مرجعیت کے پاکیزہ کاموں کو استوار کیا جاسکے۔

مرجع وقت کی وفات کی صورت میں اس کی اپنی ذات تو دنیا سے رخصت ہوجائے گی لیکن مجلسِ عاملہ موجود رہے گی اور اس کی موجودگی ایک حد تک اس بات کی ضمانت ہوگی کہ مرکز کے خالی ہونے کی صورت میں ایک باصلاحیت مرجع کی نشاندہی کرسکے اور چونکہ مجلسِ عاملہ اور اس (مذکورہ) ادارے نے ایک عرصہ تک مرجعیت کے کاموں میں حصہ لے کر اثر و نفوذ پیدا کرلیا ہوگا، لوگوں سے اس کے روابط قائم ہو چکے ہوں گے اور قوم کو اس پر اعتماد بھی ہوگا، اس لئے اس میں یہ طاقت بھی ہوگی کہ جس باصلاحیت شخص کی نشاندہی کرے اس کی بھرپور تائید و پشت پناہی بھی کرسکے اور قوم کے اندر اس شخصیت کے لئے اعتماد بھی حاصل کرے۔

اور اس طرح سابق میں ذکر کئے گئے دونوں نکات اس تیسرے نکتے سے مربوط

ہو جاتے ہیں!

''مرجعیتِ صالحہ'' کے مراحل

''مرجعیتِ صالحہ'' تین مرحلوں سے گزرے گی۔

[۱] رسالۂ عملیہ چھپنے سے قبل کا مرحلہ جس میں مرجعیت سے قبل کے اس کے تمام ادوار شامل ہیں، کیونکہ رسالۂ عملیہ کا چھپنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ مجتہد اب مرجعیت کے مرتبے پر فائز ہو رہا ہے۔

[۲] رسالہ عملیہ چھپنے کے بعد مرجعیت کی کرسی پر نشست!

[۳] ''مرجع اعلیٰ'' کے منصب پر فائز ہونا، جب وہ کسی بھی دینی موقف کو اختیار کرنے میں بالکل آزاد و مختار ہوتا ہے۔

اور ''مرجعیتِ صالحہ'' کے مقاصد کو بھی ان ہی تین مرحلوں سے گزرنا ہے۔ کیونکہ پہلے مرحلے میں وہ ''ابتدائی امور'' انجام پذیر ہوں گے جن کی طرف ہم نے گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا کہ ''مرجعیتِ صالحہ'' کے لئے یہ امور ناگزیر ہیں اور اس مرحلے کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ مستقبل میں مرجع بننے والا شخص جن کاموں کو انجام دے گا وہ زیادہ تر انفرادی قسم کے ہوں گے اور محدود اختیارات کے تحت انجام پذیر ہوں گے۔ کیونکہ یہ ان اشخاص کے عمل مرجعیت کا گویا نقطہ آغاز اور ابتدائی تجربات ہوں گے! لہٰذا مرجعیت اس مرحلے سے گزرتے وقت ''مرجعیت ذاتیہ'' کی حیثیت میں ہوگی، البتہ ان ہی دنوں محدود پیمانے پر مجلس مشاورت قائم کر کے وہ ''مرجعیت موضوعیہ'' کے ارتقائی مراحل کی طرف قدم بڑھا رہی ہوگی اور مرجعیت کے بعض کاموں میں اختصاص پیدا کر رہی ہوگی۔

لیکن جب دوسرا مرحلہ شروع ہوگا تو مرجعیت کو ''ذاتی'' سے ''موضوعی'' شکل اختیار کرنے کا موقع ملے گا، لیکن اس طرح نہیں کہ ''مرجعیت صالحہ'' کے کامل منصوبے کا اعلان کر دیا جائے اور جو لوگ ذہنی طور پر اسے قبول کرنے پر آمادہ ہیں ان کے درمیان اسے نافذ کر دیا جائے۔ کیونکہ اس سے اگرچہ ان لوگوں کی صفوں کو تقویت پہنچے گی جو اس طرز

فکر کے حامی ہیں لیکن اس طرح ''مرجعیت صالحہ'' ان بہت سے لوگوں اور شخصیتوں کی تائید سے محروم ہو جائے گی جو ذہنی طور پر ابھی اس کے لئے آمادہ نہ ہوں!

اور اس بات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں ''مرجعیت'' مجبور ہو جائے گی کہ جو تھوڑے لوگ ''مرجعیت موضوعیہ'' کے نظریئے سے متفق ہیں بس ان ہی کی مدد و نصرت پر اکتفا کرے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ مدد و نصرت جو اپنی کمیت اور کیفیت، دونوں لحاظ سے محدود ہوگی ''مرجعیت موضوعیہ'' کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔

''مرجعیت موضوعیہ'' کی تکمیل کا فطری طریقہ یہی ہے کہ ''مرجعیت صالحہ'' اپنے مشن اور اغراض و مقاصد کو ان کمیٹیوں اور متعدد اداروں کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کرے۔

ان کمیٹیوں کی تعداد موضوعِ عمل اور مرجعیت کی ذاتی اور اجتماعی توانائیوں کے اعتبار سے جتنی ضروری ہو تدریجاً بڑھائی جاتی رہے گی اور پھر ان کمیٹیوں اور دیگر اداروں کے درمیان بتدریج ہم آہنگی بھی پیدا کر دی جائے اور ان میں توسیع بھی کی جائے تا کہ آخر کار مرجعیت کا ادارہ کامل نظم و ضبط کے ساتھ استوار ہو جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب مرجعیت کی روش و اسلوبِ عمل میں اس قسم کی تبدیلی آئے گی اور وہ ''مرجعیت موضوعیہ'' کی طرف ارتقا پذیر ہوگی تو اس کی کارکردگی کی رفتار ہماری قومی زندگی کے متعدد فکری اور سیاسی عوامل کی بنا پر متاثر ہوگی۔ حوزہ علمیہ میں اس ''مرجعیت موضوعیہ'' کی معاصر طاقتیں بھی موجود ہوں گی، قوم کے اندر ان کا اثر و رسوخ بھی ہوگا، ''مرجعیت صالحہ'' کے افکار کے ساتھ ان کے مثبت یا منفی روابط بھی ہوں گے اور یہ تمام باتیں قدم قدم پر ''مرجعیت موضوعیہ'' کے ارتقا کو روک سکتی ہیں۔

لہٰذا ان تمام عوامل پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا اور جس وقت مرجعیت ان ارتقائی مراحل سے گزر رہی ہو اس بات کا تحفظ فراہم کرنا ہوگا کہ حالات کی شکست و ریخت کے نتیجے کے طور پر کہیں خود مرجعیت کو اپنی ذات ہی تبدیل نہ کرنی پڑے۔ سوائے اس کے کہ

اس کوشش میں بہت زیادہ فوائد نظر آ رہے ہوں۔ چاہے اس حیثیت کے یہ بات ایک نئ کوشش کے لئے تمہید بن جائے جو اتنی زیادہ کامیاب ثابت ہو کہ وہ ''مرجعیت صالحہ'' جو اس کوشش کو آگے بڑھا رہی تھی، اس کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والے نقصانات کی تلافی کر دے۔[1]

[1] بحوالہ: مقدمۂ مباحث الاصول از سید کاظم حائری

دوسرا مقالہ

﴿نظام مرجعیت کی بنیادی شکل﴾

شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہری رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

نظامِ مرجعیت کی بنیادی شکل

جن لوگوں کے دل میں اسلامی نظام کی سربلندی کی آرزو ہےاور جو ماضی قریب و بعید میں مسلمانوں کی ترقی اورانحطاط کے بارے میں سوچتے ہیں، ان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ روحانیت کے مقدس نظام یعنی اس ادارے کی ترقی اور سربلندی کے بارے میں نہ سوچیں جو مسلمانوں کی دینی رہبری کا ذمہ دار ہے۔

اتنا تو مسلم ہے کہ مسلمانوں کے جملہ امور کی اصلاح براہِ راست اسی ادارے کے ذریعے سے ہونی چاہئے جس کے ہاتھ میں ان کی دینی رہنمائی کی باقاعدہ ذمہ داری ہے۔ یا کم ازکم تمام اصلاحات اس ادارے کے خیالات سے مطابقت اور ہم آہنگی ضرور رکھتی ہوں۔

اگر بالفرض کسی اصلاحی یا دینی تحریک کا آغاز کسی فرد یا افراد کی طرف سے ہو لیکن اسے علماومجتہدین کی تائیدوحمایت حاصل نہ ہوتو اس کی کامیابی کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی۔

مقدس دین اسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذمہ داری مشترک ہے، یعنی سب ایک دوسرے کی ہدایت، رہنمائی اور ایک دوسرے کے مفاد کی حفاظت اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ جس شخص کو یقین ہے کہ اس پر اسلام کی طرف سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ ضرور رہنمائی کے اس نظام سے متعلق بھی ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے۔

چونکہ ہمارے کچھ سماجی دانشوروں کو دینی امور میں دلچسپی اور اعتقاد نہیں ہے اس

لئے ممکن ہے کہ وہ روحانیت کے نظام، اس کی مشکلات اور ان کے حل کے بارے میں نہ سوچتے ہوں۔ اسی طرح جو لوگ دلچسپی تو رکھتے ہیں اور سادہ لوح اور بے خبر ہیں، ان کے بھی چھوٹے سے دماغ میں اس طرح کے خیالات نہیں آتے لیکن جو لوگ اسلامی فکر بھی رکھتے ہیں اور وسیع النظر بھی ہیں، ان کی سوچ کا اہم ترین موضوع یہی ہے۔

چونکہ اس عاجز کا بھی سرمایہ افتخار صرف یہی ہے کہ وہ بھی اسی طبقہ سے منسلک اور اسی طبقہ کے خرمن کا خوشہ چیں سمجھا جاتا ہے، اس نے ایک مذہبی و علمی خاندان میں نشوونما پائی ہے اور دینی علوم کے مراکز میں عمر بسر کی ہے اس لئے جہاں تک یاد ہے جب سے معاشرتی مسائل پر کچھ سوچنے کے قابل ہوا ہے، اس موضوع پر غور و فکر کرتا رہا ہے۔

مسئلہ کی اصل بنیاد

تقریباً تیرہ سال قبل ایک روز رات کے وقت قم میں ایک دوستانہ محفل میں متعدد اساتذہ اور فضلا جمع تھے، مجھے بھی اس محفل میں شرکت کا فخر حاصل تھا۔ اثنائے گفتگو میں نظامِ روحانیت اور اس کے مسائل اور خامیوں کا تذکرہ آ گیا۔ بات یہ چل نکلی تھی کہ ماضی میں ہمارے علمی و روحانی مراکز تعلیمی لحاظ سے متنوع اور جامع ہوتے تھے۔ ان میں مختلف علوم مثلاً تفسیر، حدیث، تاریخ، فقہ، اصول، فلسفہ، کلام، ادبیات حتیٰ کہ طب اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، مگر آہستہ آہستہ ان کا رجحان محدودیت کی طرف ہوتا چلا گیا۔ یوں کہئے کہ پہلے اگر یونیورسٹیاں تھیں تو اب صرف کالج رہ گئے۔ بلکہ کچھ عرصہ سے تو صرف فقہ ہی کے کالج رہ گئے ہیں۔ باقی علوم کی باقاعدہ تعلیمی نصاب سے خارج ہوتی چلی گئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

پھر یہ کیا بات ہے کہ روحانیت کے مقدس ماحول میں زیادہ تعداد بیکار، لغو اور رکاوٹ ڈالنے والے لوگوں کی ہے، یہاں تک کہ ایک روحانی پیشوا مجبور ہے کہ ایک پھول کو سینچنے کے لئے سیکڑوں کانٹوں اور گھاس پھوس کو بھی پانی دے۔ ہمارے ہاں جمود، سکوت اور بے حسی کو آزادیٔ رائے، حریت اور زندہ صفتی پر کیوں ترجیح حاصل ہے؟ چونکہ ہر شخص

اس فکر میں ہے کہ اپنے مرتبے، منصب، حیثیت اور مقام کا تحفظ کرے، ناچار منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھا رہتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نصاب ہماری ضروریات کے مطابق مرتب نہیں کیا جاتا؟ ہمارے یہاں تصنیف و تالف اور اخبار و رسائل کی اشاعت اس قدر کیوں نہیں جس قدر ضروری ہے؟ ہمارے یہاں ناموں کے ساتھ لمبے چوڑے اور بیجا القاب لگانے کا رواج کیوں ہے اور بدقسمتی سے اس میں روز بروز اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے صالح اور روشن فکر دینی رہنماؤں کو جوں ہی کچھ اختیار حاصل ہوتا ہے، اصلاح کی طاقت اس سے سلب ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے سارے پچھلے افکار و خیالات بھول گئے ہیں۔

اس محفل میں کچھ دیر گفتگو کے بعد ان مسائل کی بنیادی وجہ کی بات آئی اور طے پایا کہ ہر شخص اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرے۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنی رائے پیش کی۔ بندے نے بھی اپنی رائے ظاہر کی لیکن ایک اور دوست نے جس رائے کا اظہار کیا وہ مجھے اپنی اور دوسرے دوستوں کی رائے کے مقابلے میں زیادہ بہتر معلوم ہوئی اور اب میرا بھی وہی خیال ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمام مشکلات اور خامیوں کی اصل اور بنیادی وجہ مالی نظام اور علما کا روزی حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ انہوں نے جو الفاظ استعمال کئے وہ کچھ یوں تھے کہ تمام خرابیوں کی علت العلل سہمِ امام ہے۔

ظاہر ہے کہ نہ یہ ان کا مطلب تھا اور نہ میرا یہ مطلب ہے کہ ہماری خرابیوں اور خامیوں کا اصل سبب سہمِ امام کی تشریع ہے بلکہ میرے عقیدے میں تو یہ قانون اس مقصد کے لئے جس کے لئے اس کی تشریع ہوئی ہے یعنی احیا و بقائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ، نہایت ہی مناسب اور حکیمانہ ہے۔ جیسا کہ میں بعد میں عرض کروں گا یہ قانون نظامِ روحانیت کے استقلال و آزادی کا بہترین ضامن ہے۔ یہ بھی مقصد نہیں کہ منتظمین اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرتے ہیں بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس قانون سے استفادہ کا جو طریقہ ہمارے یہاں آہستہ آہستہ رائج ہو گیا ہے اس نے اس نظام کو ایک خاص

شکل دے دی ہے جس کی وجہ سے بہت سی مشکلات اور خامیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

صالح نظام

بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کے بناؤ بگاڑ کا دارومدار صرف اس معاشرے کے افراد خصوصاً زعما پر ہے۔ یعنی لیڈر اگر اچھے ہوں گے تو معاشرہ بھی اچھا ہوگا اور اگر لیڈر بُرے ہوں گے تو معاشرہ بھی صالح نہیں ہوگا۔ بالفاظ دیگر ساری ذمہ داری صرف سر برآوردہ افراد کی ہے اور فقط وہی معاشرے کی درست گی یا عدم درستگی کے لئے جوابدہ ہیں۔ بہت سے لوگ اسی طرح سوچتے ہیں اور اسی سوچ کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں۔

ان لوگوں کی نگاہ جب بھی معاشرتی برائیوں کی طرف جاتی ہے تو وہ اس کا علاج یہی تجویز کرتے ہیں کہ سربراہ نیک اور صالح ہونا چاہئے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک اصل اہمیت فرد کی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اس مسئلہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ معاشرتی نظام اور اس کے تحت قائم ہونے والی تنظیموں اور اداروں کی اہمیت لیڈروں کی اہمیت سے بہت زیادہ ہے۔ ہمیں پہلے صالح نظام کے بارے میں سوچنا چاہئے، اچھے لیڈروں کی اہمیت دوسرے نمبر پر آتی ہے۔

افلاطون کا ایک معاشرتی نظریہ ہے جو افلاطون کے مدینۂ فاضلہ کے نام سے مشہور ہے۔ مسلمان فلاسفہ میں سے بھی ابونصر فارابی نے افلاطون کی پیروی کی ہے اور اس کے قائم کردہ خطوط پر اپنے نظریات کو ترتیب دیا ہے۔ ان دونوں فلسفیوں کے خیالات کی بنیاد افراد کی صلاحیتوں پر ہے اور ان کے نزدیک اصل اہمیت فرد کی ہے۔ ان دونوں نے اپنی تمام تر توجہ اس نکتہ پر مرکوز کی ہے کہ معاشرتی امور کی باگ ڈور کس قسم کے افراد کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے اور ان افراد میں کیا علمی اور عملی صفات ہونی ضروری ہیں۔ لیکن انہوں نے اس بات پر چنداں توجہ نہیں دی کہ کون سی معاشرتی تنظیم اور کون سے معاشرتی ادارے قائم کئے جائیں اور ان کے مثالی افراد کس نظام کے تحت انتظامی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں۔

ان فلسفیوں کے پیش کردہ نظریئے جو تنقید ہوئی ہے اس میں ایک خاص نکتہ یہی ہے کہ کسی نظام کا لوگوں کے (جن میں لیڈر بھی شامل ہیں) افکار اور کردار پر جو گہرا اور دوررس اثر مرتب ہوتا ہے اس کی طرف ان دونوں فلسفیوں نے توجہ نہیں دی۔ اگر نظام صحیح ہو تو بُرا آدمی بھی اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا بلکہ بعض صورتوں میں تو خود اس کے اپنے خیالات بھی بدل جاتے ہیں اور وہ ''ہر چہ در کانِ نمک رفت نمک شد'' کا مصداق بن جاتا ہے۔

ایک دانشور افلاطون کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''افلاطون نے یہ نازک مسئلہ چھیڑ کر معاشرے میں کس کو حکومت کرنی چاہئے، ایک غلط اور خطرناک سیاسی فلسفہ ایجاد کیا ہے۔ اس سے زیادہ عاقلانہ اور مثبت بات یہ ہوتی کہ وہ یہ بتلاتا کہ ہم کس طرح ایسا معاشرتی نظام قائم کریں کہ غیر صالح لیڈر معاشرے کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔''

زعمائے صالح کی اہمیت فقط اس طرزِ فکر کے لحاظ سے ہے جو وہ معاشرتی اداروں کی اصلاح اور بہبود ترقی کے بارے میں رکھتے ہیں ورنہ اگر ان کا طرزِ فکر بھی وہی ہو جو غیر صالح زعما کا ہے اور سب ایک ہی طرح کام کریں تو پھر ان میں صرف شخصی اور اخلاقی لحاظ سے فرق رہ جاتا ہے اور چونکہ صالح زعما کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی وہ کوئی قابلِ ذکر معاشرتی تبدیلی نہیں لا سکتے۔

ہم اگر افلاطون اور فارابی کے نظریئے کی توجیہہ کرنا چاہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے صرف ان صالح افراد کی اہمیت بیان کی ہے جن کا معاشرتی اداروں پر تسلط اور غلبہ ہو۔ دوسرے بے اثر لوگوں کے صالح ہونے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

معاشرتی اداروں اور معاشرے کے افراد کا آپس میں وہی تعلق ہے جو کسی شہر کی سڑکوں، گلیوں اور مکانوں کا وہاں کے باشندوں اور ذرائع آمدورفت کے ساتھ ہے۔ جس شہر میں جس طرح سڑکیں اور گلیاں بنائی گئی ہوں، اس شہر کے باشندے مجبور ہوں گے کہ

انہی سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں سے گزریں۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتے ہیں کہ جس راستے کو زیادہ صاف، آسان اور قریبی سمجھیں، اسے اختیار کر لیں۔

فرض کیجئے کہ اگر کوئی شہر بغیر نقشہ اور منصوبہ بندی کے آہستہ آہستہ پھیلتا اور بڑھتا رہا ہو تو اس شہر کے باشندے مجبور ہوں گے کہ شہر کی موجودہ وضع کے مطابق ہی اپنی زندگی ڈھال لیں اور اسی کے مطابق اپنی آمد و رفت رکھیں۔ ایسے شہر میں آمد و رفت، گاڑی چلانے اور شہر کے انتظام میں دشواری ضرور ہوگی، مگر اہلِ شہر کے لئے اس دشواری کے ازالہ کی صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ شہر کی سڑکوں، گلیوں اور مکانوں کی وضع بدل دیں۔

اگر بالفرض صالح لیڈر برسرِ اقتدار آ بھی جائیں تب بھی ان کے کام میں خامیاں رہیں گی۔ ان کے کام میں اور دوسروں کے کام میں اتنا ہی فرق ہوگا کہ جیسے کوئی ایک شخص بے ترتیب اور پُر پیچ راستوں سے گزرتے ہوئے اس راستے کا انتخاب کرے جو ان میں سے بہترین ہو۔

ہمارے دینی علوم کے مراکز کی خصوصیات

ہمارے دینی علوم کے مراکز کے کچھ ایسے اوصاف اور ایسی امتیازی خصوصیات ہیں جن کی نظیر کسی دوسرے تدریسی ماحول میں نہیں مل سکتی۔

اس ماحول میں پاکیزگی ہے، سچائی ہے، خلوص اور روحانیت ہے۔ یہی وہ روح ہے جو اس ماحول میں رچی بسی ہوئی ہے۔ چند اشخاص جن میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے، ان کا شمار مستثنیات میں ہے۔ کسی طالبِ علم کو دوسرے طلبہ پر اگر کوئی فوقیت حاصل ہوتی ہے تو اس کی بنیاد صرف علم، تقدس اور تقویٰ ہوتی ہے۔ طلبہ میں امیر بھی ہوتے ہیں، غریب بھی۔ شہری بھی ہوتے ہیں، دیہاتی بھی۔ مزدوروں کے بچے بھی ہوتے ہیں اور تاجروں اور افسروں کے بھی۔ ماضی میں امرا اور شہزادے بھی ہوتے تھے۔ مگر وہاں کسی بات کا کوئی فرق نہیں رہتا۔ اگر طلبہ کسی کی عزت کرتے ہیں اور کسی کو وقعت دیتے ہیں تو صرف تعلیمی اور روحانی امتیاز کی بنا پر۔

دینی علوم کے مراکز کا ماحول زہد اور قناعت کا ماحول ہے۔ اسراف، عیاشی اور رت جگے کی محفلیں جو دوسرے طبقوں میں عام ہیں اور جن میں کبھی کبھی دینی علوم کے طلبہ کے علاوہ دوسرے طلبہ بھی شرکت کرتے ہیں وہاں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر کسی کا ان باتوں کی طرف ذرا بھی میلان ہوتا ہے تو اس کی ناکامی یقینی ہے۔ مجموعی طور پر طلبہ قانع اور کفایت شعار ہوتے ہیں اور انہیں دوسروں پر بوجھ نہیں سمجھا جاتا۔

استاد اور شاگرد کے تعلقات مخلصانہ اور احترام آمیز ہوتے ہیں۔ شاگرد اپنے اساتذہ کے احترام کا حاضر و غائب پورے ادب سے خیال رکھتے ہیں۔ حتیٰ ان کی وفات کے بعد بھی ان کو ہمیشہ نیکی اور دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ استاد کے احترام کا اس قدر خیال صرف دینی علوم کے طلبہ سے مخصوص ہے اور ان تعلیمات کا نتیجہ ہے جو ائمہ دین سے علم کی فضیلت اور معلم کے احترام کے بارے میں ہم تک پہنچتی ہیں۔ دوسرے تعلیمی حلقوں میں، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، ان باتوں کا وجود شاذ و نادر ہی ہے۔

دینی طلبہ کی عادت یہ ہے کہ جو سبق وہ استاد سے پڑھتے ہیں، بعد میں خود اس پر غور کرتے ہیں۔ کتاب سے مطالعہ کرتے ہیں اور کسی ہم سبق کے ساتھ مباحثہ کرتے ہیں۔ اونچے درجے کے دوروس میں جو کچھ استاد سے سنتے ہیں، اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے ہیں اور رات کو اسے لکھ لیتے ہیں۔ دینی علوم کے طلبہ طوطے کی طرح رٹتے نہیں جیسا کہ علوم جدیدہ کے طلبہ کی عادت ہے بلکہ غور و فکر اور تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں۔ چونکہ کسی کتاب کو پڑھانے کا حق کسی استاد سے مخصوص نہیں اور ہر شاگرد کو اپنا استاد منتخب کرنے کا حق ہے اس لئے اگر کسی طالب علم میں استعداد ہو تو جو کتابیں وہ خود پڑھتا ہے ان سے نچلے درجے کی کتابیں (دوسرے طلبا کو) پڑھا بھی سکتا ہے۔ اس طرح ایک دینی طالبِ علم تحصیل کے ساتھ ساتھ تدریس کے فرائض بھی انجام دے سکتا ہے۔

دینی علوم کی تعلیم کا مخصوص طریقہ یہ ہے کہ طلبہ استاد سے جو سبق پڑھتے ہیں اس کا اچھی طرح مطالعہ کرتے ہیں، اس کے بعد بحث و تکرار کرتے ہیں اور پھر اس کو لکھ لیتے ہیں۔

ساتھ ہی دوسرے سب خود بھی پڑھاتے ہیں۔اس طرح ان کی تعلیم میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

طلبہ کا مقصد محض نصاب کی تکمیل نہیں۔استاد، شاگرد کو جونمبر دیتا ہے ان سے ان کے درجے اور مقام کا اندازہ نہیں لگایا جاتا۔ بلکہ مباحثہ کی مجالس، سبق کے دوران شاگرد کے اعتراضات، اس کے اپنے پڑھانے کا طریقہ اور استادوں اور اپنے سے نچلے درجہ کے طلبہ کی توجہ جذب کرنے کی صلاحیت، یہ وہ باتیں ہیں جن سے دینی علوم کے طلبہ کی استعداد کا صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے۔

دینی علوم کے طلبہ اپنی تعلیم اور تدریس کے مراحل بلا کسی تکلف کے بالکل قدرتی طور پر طے کرتے ہیں۔کوئی استاد مقرر نہیں۔وہ خود اپنی صوابدید سے جس استاد کو بہتر سمجھتے ہیں۔اس کا انتخاب کرتے ہیں۔ان مراکز میں ایک طرح کی ایسی آزادی اور ڈیموکریسی پائی جاتی ہے جس کا کسی دوسری جگہ وجود نہیں۔اس لحاظ سے وہاں انتخابِ اصلح کا قانون رائج ہے۔جدید تعلیمی اداروں میں حکامِ بالا کلاس ٹیچر کا تقرر کرتے ہیں اور اس وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹیچر اس کلاس کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔وہ کسی اونچی یا نیچی کلاس کے قابل ہوتا ہے اس لئے بسا اوقات شاگرد اس سے مطمئن نہیں ہوتے اور نہ اس کا مناسب احترام کرتے ہیں۔اسے صرف نمبر نہ ملنے اور فیل ہو جانے کے ڈر سے برداشت کرتے ہیں۔اس قسم کی بدنظمی اور بے ضابطہ باتیں کلاسیکی تعلیم میں عام ہیں۔دینی علوم کی تعلیم میں ایسی بے قاعدگیوں کا وجود نہیں اسی وجہ سے دینی علوم کے مراکز میں افراد انتخابِ اصلح کے قدرتی قانون کے مطابق آگے آتے ہیں۔جیسا کہ علمائے الٰہی کے بارے میں خود امام علی علیہ السلام نے فرمایا۔

فکانوا کتفاضل البزر ینتقیٰ منه و یلقیٰ قدمیزہ التخلیص وھذبه التمحیص

یعنی ان کی مثال اس صاف بیج کی سی ہے جسے کاشت کے لئے منتخب کیا گیا ہو۔

اسی قانون کے مطابق طلبہ درجہ بدرجہ آگے بڑھتے ہیں، یہاں تک کہ اس سیڑھی پر پہنچ جاتے ہیں جو مرجعیت سے ایک سیڑھی نیچے ہے۔ اس سیڑھی تک تو طلبہ میں مقبولیت اوران کی عقیدت مندی ہی اساتذہ کو آگے بڑھانے کا سبب بنتی ہے لیکن آخری سیڑھی تک پہنچتے ہی سہمِ امام، اس کی تقسیم اور مشاہرہ وغیرہ کے سوال درمیان میں آجاتے ہیں اور قانونِ انتخابِ اصلح کارفرمائی باقی نہیں رہتی۔

یہ توتھیں دینی علوم کے مراکز کے طلبہ کے طرزِ زندگی اوران کے طریقۂ تعلیم کی خوبیاں۔ کچھ خامیاں بھی ہیں ان کے بارے میں بھی گفتگو ضروری ہے۔

دینی علوم کے مراکز کی خامیاں

دینی علوم کے طلبہ کے لئے داخلہ کی کوئی شرائط نہیں اس لئے یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا شخص جو اس مقدس دینی ادارے میں داخل ہونے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ بھی اس میں داخل ہو جائے۔ چونکہ کوئی امتحان نہیں لیا جاتا اس لئے طلبہ چھوٹی کتابیں چھوڑ کر بڑی کتابیں پڑھنے میں آزاد ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نچلا درجے طے کئے بغیر ہی اوپر کے درجے میں پہنچ جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمی ترقی رک جاتی ہے اور وہ خود بھی بددل ہو جاتے ہیں۔

چونکہ طلبہ کے قدرتی رجحان کا اندازہ لگانے کا کوئی طریقہ رائج نہیں ہے اس لئے یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا طالبِ علم جس میں فقہ یا کلام یا ادبیات یا تاریخ یا تفسیر کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے، کسی ایسے شعبے میں چلا جائے جس کی طرف اس کا قدرتی رجحان نہ ہو اوراس طرح وہ اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے۔

کچھ عرصہ سے دینی علوم کے تعلیمی شعبے محدود سے محدود تر ہوتے چلے گئے ہیں اور رفتہ رفتہ سب فقہ میں ضم ہو گئے۔ خود فقہ کا شعبہ بھی کچھ ایسے راستے پر جا پڑا ہے کہ پچھلے ایک سو سال سے اس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔

لباسِ روحانیت کے استعمال میں غیر محدود آزادی ادارۂ روحانیت کی ایک خامی

ہے۔ رفتہ رفتہ علما نے دوسروں سے مختلف لباس کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور جس طرح فوجی سپاہیوں اور بعض دوسرے لوگوں کی ایک خاص وردی ہوتی ہے اسی طرح علما نے بھی ایک مخصوص لباس اختیار کرلیا ہے۔

مگر علما کے حلقوں میں دوسرے حلقوں کے برعکس جس کا دل چاہے بلا کسی روک ٹوک کے یہ لباس استعمال کرسکتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے افراد بھی جو علم رکھتے ہیں نہ ایمان، اس لباس کی مراعات سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے علما کی صورت بنا لیتے ہیں اور بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔

دینی علوم کے مراکز میں عربی ادبیات کی تعلیم ضرور ہوتی ہے مگر غلط طریقے سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کو برسوں عربی ادب کی تعلیم حاصل کرنے اور عربی زبان کے قواعد یاد کرنے کے باوجود عربی زبان نہیں آتی۔ نہ وہ صحیح عربی بول سکتے ہیں اور نہ فصیح عربی لکھ سکتے ہیں۔

سب سے بڑی خرابی جو دینی رہبری کے نظام میں بالفعل موجود ہے، اس کا تعلق مالی نظام اور علما کے ذریعۂ معاش سے ہے۔

مالی بجٹ کا مسئلہ

اس بارے میں کہ علما کی معاش کا کس طرح انتظام کیا جائے کئی آرا ہوسکتی ہیں۔

﴿الف﴾ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روحاینت کے لئے کسی بجٹ یعنی کسی مالی انتظام کی ضرورت نہیں اور دوسرے لوگوں کی طرح علما کو بھی کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنا چاہئے جو ان کے لئے مالی آمدنی کا ذریعہ ہو۔ دوسروں کی طرح انہیں بھی ذاتی محنت سے روزی کمانی چاہئے۔ وہ اپنا کچھ وقت روزی کمانے میں اور باقی وقت روحانی امور میں جیسے درس وتدریس، تصنیف وتالیف، افتاو تبلیغ وغیرہ میں صرف کریں۔

ان لوگوں کی رائے میں روحانیت سے متعلقہ امور اسلام میں کوئی ایسا مخصوص مشغلہ یا پیشہ نہیں ہیں کہ ان کے لئے الگ بجٹ بنایا جائے اور مالی انتظام کیا جائے۔ جو شخص اپنی معاش کا خود انتظام کر سکے صرف اس کو یہ حق ہے کہ ان کاموں کو اختیار کرے۔ اگر کوئی

شخص ان کاموں میں مشغول ہو کر معاشرے پر بوجھ بننا چاہتا ہے تو بہتر ہے کہ شروع ہی سے ایسی تکلیف نہ کرے۔

ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ طاہرینؑ کے زمانے میں بہت سے لوگ دینی وظائف انجام دیتے تھے، حرام وحلال کی تعلیم دیتے تھے، پند ونصیحت اور وعظ وتبلیغ کرتے تھے۔ درس میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے اپنے تدریسی حلقے بھی تھے مگر اس کے باوجود معاش کے لئے ان کا کوئی نہ کوئی پیشہ اور حرفہ تھا۔ ان میں سے بہت سے اپنے پیشہ ہی کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ جیسے تمار، عطار، بزاز، خزاز، طحان، سمان، حذا، وشا وغیرہ۔ ان لوگوں کا اسی نام سے حدیث وفقہ اور تاریخ کی کتابوں میں تذکرہ ہے۔

ایسی کوئی روایت موجود نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہء طاہرینؑ نے کسی ایک یا چند اشخاص کو یہ حکم دیا ہو کہ وہ اور سب کام چھوڑ کر صرف ان مشاغل میں مصروف ہو جائیں جن کو آج کل روحانی مشاغل کہا جاتا ہے، جیسے افتا وتدریس، امامت اور وعظ وتبلیغ وغیرہ۔ یہ ہے ان لوگوں کا خیال۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ اپنی معاش کا کچھ اور انتظام کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی روحانی امور کی ذمہ داری بھی لے سکیں تو یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ لیکن ایسے افراد ہمیشہ کم ہی رہے ہیں اور آج بھی بہت کم ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سب کو ایسا کرنا چاہئے اور جو ایسا نہ کر سکے وہ اس میدان میں داخل نہ ہو، کیونکہ صدرِ اسلام کے زمانے میں آج کا طرزِ زندگی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ علوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے اور علما کی ضرورت روز افزوں ہے۔ اب ضروری ہے کہ علما کی ایک جماعت اپنی پوری عمر صرف تحصیلِ علوم اور دینی امور کے انتظام وانصرام کے لئے وقف کر دے۔ اس لئے اس مقصد کے لئے خاص مالی انتظام اور ایسے بجٹ کی ضرورت ہے جس کو صحیح طریقے سے اس کام پر خرچ کیا جائے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں ضرورت اس قدر وسیع نہیں تھی نہ اسلام کے اتنے معاند اور دشمن تھے اور نہ اتنے شبہات تھے اور نہ اتنی پیچیدگیاں تھیں۔ اب یہ ضروری ہو گیا

ہے کہ ایک گروہ محض اسلام کے دفاع اور لوگوں کی دینی ضروریات پوری کرنے کے لئے مخصوص رہے۔ ہاں البتہ یہ صحیح ہے کہ بعض روحانی امور جو آج کل رائج ہیں جیسے امامتِ جماعت نہ ان کی کوئی مخصوص روحانی شان ہے اور نہ کسی کو یہ حق ہے کہ ان کو بہانہ بنا کر اور سب کاموں سے دستبردار ہو جائے اور صرف نماز کے وقت کا انتظار کرتا رہے۔ مسجد میں جائے اور واپس چلا آئے اور ختم اور فاتحہ کی زینت بنا رہے، ان باتوں کو اپنا کل وقتی کام ٹھہرا لے اور تمام عمر معاشرے پر بوجھ بنا رہے۔

بہرحال یہ کہنا فکری جمود ہے کہ صرف اس لئے کہ فلاں بات صدرِ اسلام میں نہیں تھی اب بھی نہیں ہونی چاہئے جب کہ اس بات کی ضرورت ہے۔

﴿ب﴾ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ علما اپنی ضروریات اوقاف اور صدقاتِ جاریہ سے پوری کریں۔

شاید شیعوں کو چھوڑ کر دنیا کے اور سب روحانی ادارے اوقاف اور صدقاتِ جاریہ ہی پر انحصار کرتے ہیں۔

ایران کے اکثر شہروں میں دینی علوم کے مدارس موجود ہیں اور کثیر آمدنی کے جائیدادان کے لئے وقف ہے۔ ماضی میں ان مدارس کے اوقاف سے تہران، اصفہان، مشہد، تبریز، شیراز اور دوسرے سب شہروں میں دینی علوم کی تعلیم میں بڑی مدد ملتی تھی۔

لیکن بد قسمتی سے ایسے اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جاسکتی، ان میں سے اکثر اوقاف نے آج کل ذاتی ملکیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پھر بھی کچھ اوقاف باقی ہیں۔ ان میں سے کچھ ممتاز علما کے قبضہ میں ہیں لیکن ان سے ایسے اداروں کو فائدہ پہنچ رہا ہے جن کی سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں نہیں۔ کچھ اوقاف محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہیں، وہ کسی اور طرح ضائع ہو رہے ہیں۔ بہت کم آمدنی ایسی ہے جو صحیح اور شرعی طور پر خرچ ہوتی ہے۔

نہ صرف مدارس کے اوقاف نظامِ روحانیت کے تصرف میں ہونے چاہئیں بلکہ

اور بھی منقولہ اور غیر منقولہ اموال کی ایسی بڑی بڑی مدیں ہیں جن کے لئے یہ شرعاً لازمی یا جائز ہے کہ انہیں نظامِ روحانیت کی تحویل میں دیا جائے۔حکومت کے اربابِ اختیار اور عالی مرتبہ علما کے درمیان اس سلسلے میں متعدد بار گفت وشنید ہوچکی ہے مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اگر اوقاف کا کوئی صحیح انتظام ہوجائے اور اس مقصد کے لیے کوئی معقول اور منظم ادارہ قائم ہوجائے تو اس سے نہ صرف نظامِ روحانیت کے عام اخراجات پورے ہوسکیں گے بلکہ یہ مذہب، تعلیم اور اخلاق کی ایک بڑی خدمت ہوگی لیکن اگر اوصاف کی موجودہ شکل برقرار رہی تو نہ صرف موجودہ خرابیاں باقی رہیں گی بلکہ ایسے افراد کو مزید تقویت ملے گی جو ہر اصلاح اور اسلامی معاشرے کی ہر گونہ ترقی میں سدِّ راہ رہے ہیں۔

﴿ج﴾ ایک اور صورت یہ ہے کہ سہمِ امام علیہ السلام سے استفادہ کیا جائے۔

مجھے دیگر ادیان کے متعلق تو علم نہیں کہ آیا ان میں کوئی ایسا مالی قانون موجود ہے یا نہیں جس کو علما کی زندگی اور دینی رہبری کے نظام پر منطبق کیا جاسکے۔البتہ اسلام میں شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق خمس کی آیت سے ایسا قانون اخذ کیا جاسکتا ہے اور اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

خمس کا تعلق لڑائی میں ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت سے، معدنیات سے، سالانہ خالص آمدنی سے اور بعض دوسری چیزوں سے ہے جن کے بارے میں ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ذاتی اخراجات وضع کرنے کے بعد ان کا پانچواں حصہ دینی رہبری کے ادارے کی تحویل میں دے دے۔خمس کا نصف سہمِ امام کہلاتا ہے جس کا مصرف شیعہ فقہا کی رائے کے مطابق تحفظ وبقائے دین ہے۔

بحالات موجودہ صرف یہی ایک مالی انتظام ہے جس پر عملاً ہمارا روحانی نظام چل رہا ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارے روحانی اداروں نے ایک خاص طرز اور روش اختیار کی ہے۔ہمارے جملہ دینی امور پر سہمِ امام کا گہرا اثر ہے۔

علما اور مجتہدین اس رقم کو وصول کرنے کے لئے جو ایک قسم کا ٹیکس ہے کوئی جبر

نہیں کرتے۔ مومنین ازخود اپنی خوشی سے ان علما کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ شرعی ٹیکس ادا کرتے ہیں جن پر انہیں اعتماد اور اطمینان ہوتا ہے۔ علما کے پاس اس ٹیکس کو جمع کرنے کے لئے کوئی خاص ادارہ نہیں ہے۔ لوگ خود اپنے ایمان اور وجدان کی بنا پر چھوٹی بڑی رقمیں، چھوٹی سے چھوٹی رقم سے لے کر لاکھوں تک ادا کرتے ہیں۔

سہمِ امام کی وہ خصوصیت جو اسے اوقاف سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس کے ساتھ ادا کنندگان کے جذبات اور عقیدت کا اظہار بھی شامل ہوتا ہے۔

عوام کس کو سہمِ امام ادا کرتے ہیں، یہ ان کے اپنے اندازے اور حسنِ ظن پر موقوف ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ شخص واقعی اس کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں یہ اس پر موقوف ہے کہ عوام کا اندازہ کس حد تک صحیح ہے اور یہ کہ صلاحیت کے علاوہ کسی اور عامل کو تو اس میں دخل نہیں۔ بہرحال سہمِ امام کی وصولی میں علت ومعلول کا ایک منظم سلسلہ کارفرما ہوتا ہے۔ کسی شخص کو کسی وجہ سے شہرت حاصل ہوجاتی ہے، لوگوں کو اس سے حسنِ ظن ہوجاتا ہے، اس کے بعد سہمِ امام اس کے پاس پہنچنے لگتا ہے اور اس طرح وہ دینی زعامت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

مرکزیت اور طاقت

اب سے سو سال پہلے تک جب جدید تمدن کی روشنی ایران تک نہیں پہنچی تھی اور مختلف شہروں کے درمیان ذرائع مواصلات کم تھے، ہر شہر کے باشندے عموماً واجب الادا رقم خود اپنے شہر کے علما کو ہی ادا کرتے تھے اور عموماً وہ رقم وہاں ہی خرچ ہوتی تھی۔ لیکن پچھلی ایک صدی میں مواصلات کے جدید نظام اور فاصلوں کے کم ہوجانے کے نتیجے میں طریقہ یہ ہوگیا ہے کہ رقوم صرف ان حضرات کو ادا کی جاتی ہیں جو مرجع تقلید ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ لوگوں کو جذباتی لگاؤ تھا اور ان کی بات سنی اور مانی جاتی تھی۔ ان تک سہمِ امام پہنچنے سے علمی مراکز کی ترقی اور توسیع کے نئے امکانات پیدا ہو گئے۔ مجموعی طور پر مواصلات اور ذرائع آمد ورفت میں توسیع، مراجع تقلید سے لوگوں کا قریبی رابطہ، دینی تعلیم کے مراکز میں توسیع، طلبہ اور فارغ التحصیل افراد کی تعداد میں اضافہ اور ان افراد کے جملہ شہروں اور

دیہاتوں میں پھیل جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے دینی زعما وجود میں آ گئے جن کے ہاتھ میں بڑی طاقت تھی اور جن کا زبردست اثر ورسوخ تھا۔

وہ شخصیت جسے پچھلی صدی میں پہلی بار ایسا اثر و رسوخ حاصل ہوا اور جدید مواصلاتی ذرائع نے جس کی قیادت کا دائرہ وسیع کرنے میں بڑی مدد دی، وہ مجتہدِ بزرگ مرحوم آیت اللہ حاجی مرزا محمد حسن شیرازی علیہ الرحمۃ کی شخصیت تھی جن کے ہاتھ میں پورے ملک کی دینی قیادت تھی۔ ان کی قیادت اور ان کے اثر کا پہلا مظہر وہ مشہور فتویٰ تھا جو انہوں نے تمباکو کی حرمت کے بارے میں دیا تھا۔[1] ان کے بعد ان کے اخلاف کے ہاتھ میں بھی کم وبیش ایسی ہی قیادت رہی۔

سہمِ امام کی وصولیابی کا طریقہ وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا۔ رہا اس کا سنت کے مطابق صرف، تو یہ سو فیصد اس شخص کی ذاتی رائے پر منحصر ہے جس کے پاس سہمِ امام پہنچے۔ ابھی تک یہ دستور نہیں کہ آمد وخرچ کا کوئی حساب رکھا جائے یا کوئی گوشوارہ بنایا جائے۔ سہمِ امام کے صحیح مصرف میں خرچ کا زیادہ تر تعلق اس بات سے ہے کہ جس کو رقوم ادا کی جارہی ہیں وہ کس حد تک زہد وتقویٰ اور خدا ترسی کے اوصاف سے متصف ہے اور لوگوں نے اس کو پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں کی اور کچھ اس بات سے ہے کہ اس میں انتظامی قابلیت کس قدر ہے۔

خوبیاں اور خامیاں

سہمِ امام کا جو طریقہ اس وقت رائج ہے اس میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ خوبیاں تو یہ ہیں کہ اس کا دارومدار فقط لوگوں کے ایمان اور عقیدے پر ہے۔ شیعہ مجتہدین حکومت کے تنخواہ دار اور وظیفہ خوار نہیں ہیں اور نہ ان کا عزل ونصب اربابِ اقتدار کے ہاتھ میں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی آزادی محفوظ اور برقرار ہے اور حکومت کے پہلو بہ پہلو وہ بھی ایک طاقت شمار ہوتے ہیں اور بعض موقعوں پر انہوں نے سختی سے حکومت کی مزاحمت کی ہے۔

اسی آزادانہ مالی انتظام کی وجہ سے، جس کا انحصار لوگوں کے عقیدے پر ہے وہ

---

[1] ۱۳۰۹ ہجری میں آیت اللہ نے ایران میں تمباکو کے عارضی امتناع کا فتویٰ صادر کیا تھا۔

اکثر موقعوں پر حکومت کی بے راہ روی کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور کئی حکومتوں کو گرا سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہی سہمِ امام شیعہ روحانیت کی کمزوری بھی ہے۔ شیعہ علما حکومت کی اطاعت پر تو مجبور نہیں لیکن انہیں عوام کے عقیدے اور ان کے طور طریقوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے تاکہ عوام کو ان سے عقیدت اور حسنِ ظن باقی رہے۔ شیعہ روحانیت کی زیادہ تر خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔

شیعہ علما اور سنّی علما

اگر ہم شیعہ دینی قیادت کا مصر میں جامع ازہر کی قیادت سے موازنہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ دونوں کو بلحاظِ نظم ایک دوسرے پر ایک طرح کی فوقیت حاصل ہے۔

مصر میں خاص وجوہات کی بنا پر جن میں سب سے اہم دو باتیں ہیں ایک تو آزاد ذریعۂ آمدن کا ہونا اور دوسرے اولی الامر کے بارے میں ان لوگوں کا طرزِ فکر۔ شیخ الازہر کا انتخاب اور تقرر رئیسِ جمہوریہ خود کرتا ہے۔ مصر میں شیخ الازہر کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہمارے ملک میں سپریم کورٹ کے ججوں کا تقرر سربراہِ مملکت کے فرمان کے ذریعے سے ہوتا ہے لیکن ایران کے روحانی نظام میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ اگر دینی قیادت سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اسے حکومت کی حمایت حاصل ہے تو یہ بات اس کی ناکامی کا سبب بن جائے گی۔

تقریباً تین سال ہوئے ہیں میں نے ایک اخبار میں شیخ الازہر و مفتی اعظم مصر علامہ شیخ محمود شلتوت کی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سر کے اوپر جمال عبدالناصر کا فوٹو آویزاں تھا۔ ایران میں یہ ممکن نہیں کہ کسی معمولی طالبِ علم کے کمرے میں بھی حکومت کے کسی رکن کا فوٹو دیکھا جا سکے۔ مصر کا روحانی رہنما کبھی اتنی طاقت حاصل نہیں کر سکتا کہ کسی ایسے معاملہ میں جیسا یہاں تمباکو کا قضیہ تھا حکومتِ وقت کو جھکنے پر مجبور کر سکے کیونکہ خود اس کا انحصار حکومت پر ہے۔

لیکن دوسری طرف چونکہ مصری علما اپنی زندگی اور معاش کے لئے عوام کے محتاج

www.kitabmart.in

نہیں، اس لئے انہیں عقیدے کی آزادی حاصل ہے اور وہ اس پر مجبور نہیں کہ عوام کو خوش کرنے کے لئے حقائق کو چھپائیں۔ موجودہ حالات میں کسی شیعہ دینی رہنما سے یہ امید نہیں کی جاسکتی چاہے وہ کتنا ہی وسیع النظر، مخلص اور اصلاح کا خواہشمند ہو کہ وہ کوئی ایسا فتویٰ دے سکے گا جیسا کہ شیخ شلتوت نے دوسال قبل دیا تھا جس نے ہزار سالہ طلسم توڑ دیا۔ کوئی شیعہ دینی رہنما اتنا بڑا اقدم تو کیا اس سے بہت چھوٹا قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب ایران اور مصر کے دینی علما کی حالت معاشی لحاظ سے تقریباً یکساں تھی، ایرانی علما وسیع النظری، تصانیف کے تنوع اور مختلف علوم میں ایجاد و اختراع کے لحاظ سے کسی طرح مصری علما سے پیچھے نہیں تھے بلکہ خود مصری علما کو اعتراف ہے کہ ایرانی تمام علوم میں آگے تھے، لیکن آج کل معاملہ برعکس ہے۔ ایران کے روشن فکر مسلمانوں کی نگاہیں مصر کے دانشوروں پر لگی رہتی ہیں جو مسلمانوں کے ان معاشرتی مسائل پر جن کی اس وقت اشد ضرورت ہے نئی نئی تصانیف شائع کرتے رہتے ہیں۔ ایرانی اپنے مذہبی علما سے مایوس ہیں اس لئے کہ ان سے بحالاتِ موجودہ سوائے عوام کے کام آنے والے رسائلِ عملیہ یا دوسری ایسی سطحی تصانیف کے جو صرف عوام کو مطمئن کرسکتی ہیں اور کسی چیز کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ [1]

صرف پچھلے تیس چالیس سال کی مدت میں کچھ چنیدہ وہ مخلص افراد نے خود کو روحانیت کے تمام مالی نظام سے علیحدہ کرکے اسلامی معاشرے کی موجودہ ضروریات کے مطابق تحقیق و تالیف کا کام شروع کیا ہے۔

اہلِ نظر اعتراف کرتے ہیں کہ شیعہ مراکزِ علمی کے فارغ التحصیل حضرات کی جو کتابیں پچھلے چند برسوں میں شائع ہوئی ہیں وہ مصری دانشوروں کی تصنیفات سے زیادہ

---

[1] یاد رہے کہ یہ خطاب ایران میں اسلامی انقلاب کے ظہور سے قبل کا ہے۔ اب ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد ایرانی علما کی اسلام کے اخلاقی، اقتصادی، سیاسی، معاشرتی الغرض تمام شعبہ ہائے حیات سے متعلق گرانقدر تالیفات سامنے آئی ہیں۔

مخلصانہ اور بلند پایہ ہیں۔

طاقت اور آزادی

اگر کوئی عالم معاش کے لئے لوگوں پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کا اثر ونفوذ بڑھتا ہے مگر وہ آزادی کھو دیتا ہے اور اگر حکومت پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اپنی قدرومنزلت کھو دیتا ہے لیکن آزادئ رائے محفوظ رہتی ہے کیونکہ عام طور پر عقیدت مند مخلص تو ہوتے ہیں لیکن بے خبر ہوتے ہیں اور ان کی سوچ بھی سطحی ہوتی ہے اس لئے وہ اصلاحات کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ علما جو لوگوں پر بھروسہ کرتے ہیں، وہ حکومت کے مظالم اور زیادتیوں کے خلاف تو جدوجہد کر سکتے ہیں لیکن عوام کے جاہلانہ عقائد وافکار کے مقابلے میں بے بس ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو حکومت پر بھروسہ کرتے ہیں وہ عوام کے جاہلانہ خیالات کا تو کامیابی سے مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن حکومت کے مظالم کے سامنے بے دست و پا نظر آتے ہیں۔

ہمارے خیال میں ایرانی علما کا صرف عوام کے عقیدے پر بھروسہ ان کی کمزوری کا اصل سبب نہیں بلکہ اس کا بڑا سبب موجودہ مالی نظام میں تنظیم کا فقدان ہے۔ اگر اس نظام کو باقاعدہ اور منظم شکل دے دی جائے تو یہ نقص دور ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں علما کی قدرومنزلت بھی باقی رہے گی اور انہیں آزادی بھی حاصل ہو جائے گی۔ اس گفتگو کی اصل غرض اسی کی تلقین ہے اور ہمارے نزدیک علما کے لئے یہی معیاری صورت ہے۔ طریقۂ اصلاح کے عنوان سے ہم اس بات کی مزید وضاحت کریں گے۔

عوام زدگی

بہت سی صورتوں میں معاشرے کی مثال ایک فرد کی سی ہے۔ جس طرح فرد آفاتِ ارضی وسماوی سے دوچار ہوتا ہے، اسی طرح معاشرہ بھی بعض آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے، اگرچہ ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ہر معاشرے پر کچھ مخصوص آفات آتی ہیں۔ جس آفت نے ہمارے معاشرے کو مفلوج اور بے دست و پا کر رکھا ہے وہ عوام زدگی ہے۔ عوام

زندگی کی مصیبت سیلاب اور زلزلے کی مصیبت سے بھی بڑھ کر ہے اور اس کا بڑا سبب ہمارا مالی نظام ہے۔

اسی آفت کی وجہ سے ہمارے علما، پیشرو اور قائد ہونے کی بجائے عوام کے قافلے کے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں اور صحیح معنوں میں رہبر نہیں بن سکتے۔ عوام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ماضی سے اور پرانی عادات سے چمٹے رہتے ہیں۔ وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے اور موجودہ حالات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ عوام الناس ایسے سنجیدہ مسائل، جیسے دولت کی منصفانہ تقسیم، سماجی انصاف، لازمی تعلیم، قومی حاکمیت وغیرہ کو بچوں کی بیکار باتیں سمجھتے ہیں حالانکہ ان مسائل کا اسلام سے اٹوٹ اور شکست ناپذیر تعلق ہے اور ان حقائق کو اسلام ہی نے آشکارا کیا ہے اور وہ خود ان کا حامی اور موید ہے۔

ان حالات میں ہمارے عوام زدہ علما کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب بھی کوئی معاشرتی مسئلہ اٹھے، وہ غیر اصولی اور سطحی باتوں کے پیچھے دوڑنے لگیں اور اصولی باتوں سے کنی کاٹ جائیں، یا ان مسائل پر اس طرح اظہارِ رائے کریں کہ اسلام غیر ترقی پسند اور پسماندہ نظر آئے اور دشمن اس کا مذاق اڑائیں۔

افسوس کہ اس عظیم آفت نے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ اسلام ہر زمانے اور ہر دور کے لئے موزوں نظام ہے۔ ''**لا یفنیٰ عجائبه ولا ینبقضی غرائبه**'' اور یہ بھی ظاہر ہو جاتا کہ اس صدی کے ترقی یافتہ ترین سماجی نظام بھی اسلامی نظام کی برابری نہیں کر سکتے۔

ہمارے عوام زدہ علما مجبور ہیں کہ سکوت کو کلام پر، سکون کو حرکت پر اور نفی کو اثبات پر ترجیح دیں، اس لئے کہ عوام کا مزاج یہی ہے۔

عوام کے تسلط کے نتیجہ میں ہمارے روحانی معاشرے میں ظاہر داری، تصنع، بناوٹ اور بلند و بالا القاب و آداب کی وہ گرم بازاری ہے جس کی نظیر دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔

عوام کے تسلط نے ہمارے آزاد منش اور اصلاح پسند علما کے دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

جن ایام میں میرا قیام قم کے علمی مرکز میں تھا مجھے مرحوم آیت اللہ بروجردی اعلیٰ اللہ مقامہ کے درس میں شرکت کا شرف حاصل تھا۔ ایک دن فقہ کے درس میں ایک حدیث آ گئی جس کا مضمون یہ تھا کہ کسی نے امام صادق علیہ السلام سے ایک مسئلہ پوچھا۔ حضرت کے جواب پر اس شخص نے کہا کہ اس سے پہلے یہی مسئلہ میں نے آپ کے والدِ ماجد امام باقر علیہ السلام سے پوچھا تھا۔ انہوں نے کچھ اور طرح جواب دیا تھا۔ کونسی بات صحیح ہے؟ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ جو میرے والد نے کہا تھا وہی درست ہے۔

پھر آپؑ نے فرمایا:

ان الشیعة اتوابی مسترشدین فافتاهم بمر الحق واتونی شکاکا فافتیتهم بالتقیة

یعنی: اس وقت کے شیعہ جو میرے والد کے پاس آتے تھے وہ خلوصِ نیت سے آتے تھے اور ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حقیقت معلوم کر کے اس پر عمل کریں، اس لئے وہ بھی ان سے حقیقت بیان کر دیتے تھے لیکن اب جو لوگ میرے پاس آتے ہیں، ان کا مقصد رہنمائی حاصل کرنا اور عمل کرنا نہیں، وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ میں کیا کہتا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھ سے کوئی بات سن کر اِدھر اُدھر لگائی بجھائی کرتے پھرتے ہیں اور فتنہ پھیلاتے ہیں۔ مجبوراً میں بھی تقیہ سے جواب دیتا ہوں۔

چونکہ یہ حدیث جس میں تقیہ کا مضمون تھا شیعہ روایت تھی اور مخالفین کی گھڑی ہوئی بات نہیں تھی اس لئے مرحوم کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے دل کی خلش بیان کریں۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، ہم خود تقیہ کے لئے مجبور ہیں۔ اپنی مرجعیت کے ابتدائی دور میں میرا خیال تھا کہ میرا کام احکام کا استنباط ہے اور لوگوں کا کام ان احکام پر عمل کرنا۔

میں جوفتویٰ دوں گا لوگ اس پر عمل کریں گے لیکن بعض ایسے فتووں کے دوران میں جو لوگوں کے مزاج اور طبیعت کے خلاف تھے میں نے دیکھا کہ دراصل یہ بات نہیں ہے۔

واضح رہے کہ جس قسم کے تقیہ کا حدیث میں تذکرہ ہے وہ اس تقیہ سے مختلف ہے جس کا انہوں نے ذکر کیا۔ حدیث میں جس تقیہ کا تذکرہ ہے وہ ہمارے روحانی ماحول سے مخصوص نہیں۔ ایسا تقیہ تو ساری دنیا میں کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔ رہا وہ تقیہ جس کا رواج ہمارے روحانی ماحول میں ہے وہ البتہ اس نظام سے مخصوص ہے جو کچھ عرصے سے ہمارے یہاں وجود میں آ گیا ہے۔ مرحوم کو چونکہ ایک موقع مل گیا تھا لہٰذا انہوں نے اپنے دل کی خلش کا اظہار کر دیا۔

حوزۂ علمیہ قم کے بانی مرحوم آیت اللہ الحاج شیخ عبدالکریم حائری یزدی اعلیٰ اللہ مقامہ کا خیال تھا کہ دینی علوم کے کچھ طلبہ کو کوئی غیر ملکی زبان اور بعض جدید علوم سکھلائے جائیں تاکہ وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں بلکہ غیر ممالک میں بھی تبلیغ کریں۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو عوام اور نیم تعلیم یافتہ افراد کا ایک گروہ تہران سے قم پہنچا اور مرحوم کو الٹی میٹم دیا کہ یہ روپیہ جو سہمِ امام کے نام سے لوگ دیتے ہیں اس لئے نہیں کہ طلبہ کفار کی زبان سیکھیں۔ اگر یہ صورت رہی تو ہم یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ جب مرحوم نے دیکھا کہ اس طرح تو علمی مرکز برباد ہو کر ختم ہی ہو جائے گا تو انہوں نے وقتی طور پر اس منصوبے کو ترک کر دیا۔

چھ سال قبل مرحوم آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی اعلیٰ اللہ مقامہ کے دورِ قیادت میں نجفِ اشرف کے مقتدر علما کی ایک معتد بہ تعداد نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ جو علما اس جلسے میں شریک تھے ان میں سے بعض اس وقت مرجع تقلید ہیں۔ غرض تبادلۂ خیالات کے بعد اتفاقِ رائے سے یہ طے پایا کہ مسلمانوں کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے طلبہ کے نصاب پر نظرِ ثانی کی جائے۔ ان مسائل کو جو عقائد کا جزو ہیں، نصاب میں شامل کیا جائے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ نجف کا علمی مرکز صرف فقہ کی تعلیم اور رسائلِ عملیہ کی تالیف سے مخصوص نہ رہے۔

مرحوم آیت اللہ اصفہانی ان واقعات سے جو مرحوم آیت اللہ حائری وغیرہ کو پیش آئے تھے، سبق لے چکے تھے انہوں نے پیغام بھیجا کہ جب تک میں زندہ ہوں، کسی کو یہ حق نہیں کہ اس علمی مرکز کی ساخت میں کوئی ردوبدل کرے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ طلبا کو دیا جانے والا سہمِ امام فقط فقہ اور اصول کی تعلیم کے لئے ہے اور کسی چیز کے لئے نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ کارروائی ان حضرات کے لئے سبق آموز تھی جن کے ہاتھ میں اس وقت نجف کے علمی مرکز کا اہتمام ہے۔

اس وضاحت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ہماری سربرآوردہ شخصیات برسرِ کار آتے ہی اپنے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کیوں اپنے آپ کو عاجز محسوس کرتی ہیں اور اس کے باوجود کہ ان کے دل میں اصلاح کی فکر بھی ہوتی ہے اور انہیں اصلاح نہ کر سکنے پر دکھ بھی ہوتا ہے، وہ کیوں عملاً کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کیوں ہمارے دینی مراکز یونیورسٹی کی بجائے محض فقہ کے کالج بن گئے ہیں اور ہمارے علما و فضلا کو اگر فقہ اور اصول کے علاوہ دیگر علوم سے واقفیت ہوتی بھی ہے تو وہ اسے چھپانے کی کیوں کوشش کرتے ہیں؟ ہمارے مقدس روحانی ماحول میں بیکار گھاس پھوس کی اتنی کثرت کیوں ہے کہ ایک روحانی پیشوا مجبور ہے کہ ایک پھول کو سینچنے کے لئے بے شمار کانٹوں اور غیر ضروری گھاس پھوس کی بھی آبپاشی کرے؟ ہمارے روحانی ماحول پر معقولیت، حرکت اور زندگی کے آثار کی بجائے جمود اور مردنی کیوں چھائی ہوئی ہے؟ ہمارے یہاں آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عقیدہ کی کمی کیوں ہے؟ دینی علوم کے طلبہ کا نصاب زمانے کی ضروریات کے مطابق کیوں ترتیب نہیں دیا جاتا؟ ہمارے علما معاشرے کے ہادی و رہنما ہونے کے بجائے اس کے پیچھے کیوں چلتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

طریقۂ اصلاح

اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے علما اور دینی اداروں کے لئے کوئی عمومی نوعیت کا مالی انتظام نہ ہو اور ہر شخص صرف اپنی ذاتی محنت سے روزی کمائے اور نہ ہی

اصلاح کا یہ طریقہ ہے کہ ہمارے علما بھی مصر کی طرح حکومت کے ماتحت ہو جائیں۔

اصلاح کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ موجودہ نظام ہی کو با قاعدہ اور منظم بنایا جائے۔ سہم امام کی موجودہ شکل کچھ ایسی ہی ہے کہ جیسے حکومت معلمین کی معاش کے لئے کوئی تعلیمی ٹیکس لگائے اور خود معلموں ہی کو یہ ٹیکس لوگوں سے براہِ راست وصول کرنے پر مامور کر دے۔ ہر معلم کو اختیار ہو کہ وہ جتنی چاہے رقم اکٹھی کرے البتہ یہ اس کی اخلاقی ذمہ داری ہو کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد دوسروں کو دے دے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ صورت ہو تو تعلیم و تربیت کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس صورت میں معلم بچوں کو وہی تعلیم دیں گے جو ان کے سرپرستوں کو پسند ہو۔ اور ظاہر ہے یہ سرپرست عوام میں سے ہوں گے۔ اس طرزِ عمل سے وہ لوگ آگے آجائیں گے جو عوام کی من پسند بات کہہ کر انہیں لبھائیں گے اور دانشمند اور اصلاح طلب لوگوں کی کوئی بات بھی نہیں سنے گا۔ ریاکاری، موقع پرستی، ظاہرداری اور حقیقت پوشی کا بازار گرم ہو جائے گا اور وہ تمام عیوب و نقائص رواج پائیں گے جن سے کسی نہ کسی طرح عوام میں مقبولیت حاصل کی جا سکے۔ اس طرزِ عمل کا ایک اور نتیجہ یہ ہوگا کہ معلم بچوں کے سرپرستوں کو اپنی آسامی سمجھے گا اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے ہر وہ ممکن تدبیر کام میں لائے گا جو ایک کارخانہ دار مزدوروں سے اور زمیندار کسانوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے کام میں لاتا ہے۔ اس طرح وہ خرابیاں بھی پیدا ہوں گی جن کا تعلق عوام کی توجہ جذب کرنے سے ہے جیسے ریاکاری، ظاہرداری، حقیقت پوشی اور گدا مسلکی اور وہ خرابیاں بھی پیدا ہوں گی جن کا تعلق دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے ہے جیسے کینہ، بغض، نفسیاتی الجھاؤ اور قنوطیت۔

ہمارے علما کے مالی نظام کی شکل اس وقت بالکل یہی ہے اور اس کی اصلاح کا فقط یہی ایک طریقہ ہے کہ اس نظام کو با قاعدہ بنایا جائے۔ اس کا مشترک فنڈ قائم کیا جائے، ہر رقم کا اندراج ہو، ہر مرکز میں آمد و خرچ کا با قاعدہ حساب رکھا جائے اور اس کا گوشوارہ بنایا جائے۔ کوئی عالم براہِ راست لوگوں سے اپنی معاش وصول نہ کرے۔ فنڈ کی نگرانی درجہ

اوّل کے مجتہدین کے ہاتھ میں ہو اور ہر شخص کو اس کی خدمات کے تناسب سے اس فنڈ سے رقم ادا کی جائے۔

اگر یہ کام ہو جائے تو لوگ بھی اپنے عقیدے کی بنا پر خلوصِ نیت سے واجب الادا رقم ادا کریں گے اور علما کو بھی عوام کے تسلط اور ان کے پنجے سے نجات مل جائے گی۔ ساری خرابی کی وجہ یہ ہے کہ علما براہِ راست عوام کے ہاتھ سے اپنی روزی وصول کرتے ہیں اور اس مقصد کے لئے انہیں ذاتی طور پر معطیان سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنی پڑتی ہے۔

وہ تمام مرجع تقلید جن کے اہتمام وانصرام کا مدار سہمِ امام پر ہے جسے وہ وصول کر کے علمی اداروں کے طلبہ کو دیتے ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذاتی طور پر مومنین کا اعتماد حاصل کریں اور ان سے رقم حاصل کریں۔ موجودہ حالات میں چھوٹے شہروں کے علما کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ روحانیت کو پیشہ بنا کر مسجد کو اپنے کاروبار کا مرکز قرار دیں۔

اگر اس صورتِ حال کی اصلاح ہو جائے تو پھر کسی کو براہِ راست لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بلند پایہ مراجع تقلید آزاد ہو جائیں گے۔ مساجد جو آج کل کمائی کے تھڑے بنی ہوئی ہیں ان کی افسوسناک صورتِ حال نہیں رہے گی۔ جامع گوہر شاد جیسی بڑی مساجد کے ہر گوشے میں الگ الگ جماعت نہیں ہوا کرے گی (جس پر ہر سمجھدار آدمی اعتراض کرتا ہے۔) اس سوال کا بھی موقع نہیں رہے گا کہ یہ کیا بات ہے کہ اہلِ تسنن میں تو نمازِ باجماعت شوکت وجلال کا مظہر ہے اور اہلِ تشیع میں تفرقہ اور اختلاف کی نشانی۔

ذریعۂ معاش

معاش کا مسئلہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی زندگی کا ایک بنیادی ستون ہے۔ اس میں خلل آنے سے زندگی کے تمام معاملات کا اثر پذیر ہونا ناگزیر ہے۔

یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی

طرف پوری توجہ دی ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کوتو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اسلام نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ انسانی زندگی سے متعلق تمام معاملات کی تہہ میں یہی ایک عامل کارفرما ہے، لیکن حقیقت پسندوں کے خیال میں یہ بات توصحیح نہیں مگر اسلام معاش کے بنیادی کردار کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اسلام معاشی اصلاح کو ہر چھوٹی بڑی معاشرتی تنظیم کے لئے ایک ضروری شرط قرار دیتا ہے۔ گوصرف اسی ایک شرط کا وجود کافی نہیں سمجھتا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ معاش کا مسئلہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی زندگی کا ایک بنیادی ستون ہے اور اس میں خلل آنے سے زندگی کے تمام معاملات کا متاثر ہونا لازمی ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک دیندار عالم کئی سال تحصیلِ علم کے بعد اپنے چند افرادِ خانہ کے ساتھ کسی شہر میں مقیم ہو جاتا ہے اور کسی مسجد میں اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے، چونکہ وہ دیندار ہے اس لئے بقدرِ امکان اپنے فرائض بجالائے گا، مسائل بیان کرے گا، وعظ کہے گا، اخلاق، تفسیر اور اسلامی تاریخ کے موضوعات پر گفتگو کرے گا، لیکن چونکہ بہرحال وہ انسان ہے اس لئے اس کا کچھ خرچ بھی ہے۔ اگر مراکزِ روحانیت سے اس کی معاش کا انتظام نہیں ہوتا تو وہ مجبور ہوگا کہ لوگوں سے براہِ راست اپنی روزی حاصل کرے اور اپنے عقیدت مندوں کو ایک نفع اندوز کی نگاہ سے دیکھے اور چونکہ ممکن ہے کہ شہر میں اس جیسے کچھ اور لوگ بھی موجود ہوں اور وہ بھی اسی طرح زندگی بسر کررہے ہوں تو قانونِ قدرت کے مطابق لامحالہ ان میں ایک طرح کا مقابلہ اور مسابقہ پیدا ہو جائے گا، کہ کون زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کرسکتا اور اپنا عقیدت مند بنا سکتا ہے۔ اس باہمی مقابلے کے نتیجہ میں اس عالم کے لئے عوام کے مزاج کو ملحوظ رکھنا اور بھی ضروری ہو جائے گا۔ جب وہ بیچارہ یہ دیکھے گا کہ عوام کی مخالفت مول لے کر اس کا گزارہ نہیں ہوسکتا تو ممکن ہے وہ یہ سوچنے لگے کہ نہی عن المنکر تو اس وقت واجب ہے جب اس کی وجہ سے کسی تکلیف اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اگر اس سے نقصان پہنچتا ہو تو پھر یہ واجب ساقط ہو جاتا ہے۔

چونکہ اس کی روزی کا مدار عوام پر ہے اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اسے اپنی شرعی

ذمہ داری کا احساس اور خیال ہی نہ رہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو سخت معاشی دشواریوں کے باوجود اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے ہیں اور پوری کر رہے ہیں۔ وہ دوسروں سے رقابت رکھنے کی یا اپنے عقیدت مند پیدا کرنے کی کوشش سے بالاتر ہیں لیکن ایسے افراد مستثنیات میں سے ہیں اور ہم عام اور معمولی آدمیوں کی بات کر رہے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایسی صورتِ حال پیدا نہ کر سکیں جس میں صرف منتخب اور چیدہ افراد ہی اپنے منصبی فرائض انجام دے سکیں۔

ایمان وتقویٰ کا اثر

ممکن ہے قارئین یہ خیال کریں کہ ہم نے ایمان وتقویٰ کے ان حیرت انگیز مناظر کو فراموش کر دیا ہے جو ماضی میں دیکھنے میں آئے ہیں اور مسائل کا جائزہ صرف معاشی جھروکے سے جھانک کر لیا ہے، اس لئے ہمارا بیان کردہ اصول فقط دنیاوی معاشرتی تنظیموں پر ہی صادق آتا ہے۔ روحانی تنظیم جس کی تشکیل ایسے متقی اور پرہیزگار افراد کرتے ہیں جن کا تعلق روحانیت سے ہے اس میں انتظامی اداروں اور باقاعدہ قانون کی جگہ روحِ ایمانی کام کرتی ہے اور وہی اسے ہر نوع کا استحکام بخشتی ہے۔

میں عرض کروں گا کہ یہ بات نہیں ہے۔ مجھے ایمان وتقویٰ کے حیرت انگیز اثر کا اعتراف ہے۔ ایمان وتقویٰ بہت سی مشکلات حل کر دیتے ہیں اور بہت سی استحکام بخشنے والی دوسری تدابیر کی جگہ بھی ضرور لے لیتے ہیں۔ اگر اتنی بڑی بڑی رقمیں اسی آزادی سے اور اسی طرح بغیر کسی حساب کتاب اور آمد وخرچ کے گوشواروں کے کسی غیر روحانی تنظیم کے سپرد کر دی جائیں تو ظاہر ہے کیا حال ہوگا۔ حکومت کے محکموں میں باوجود اس کے کہ بڑے لمبے چوڑے انتظامی ادارے موجود ہیں، ذمہ داریاں معین ہیں، بے قاعدگی اور بدعنوانی پر سزائیں بھی دی جاتی ہیں، عدالتیں بھی موجود ہیں، حساب بھی آڈٹ ہوتے ہیں لیکن اس سب انتظام کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آئے دن لاکھوں کے غبن کے مقدمات چلتے رہتے

ہیں۔ یہ مذہب اور روحانیت ہی کی طاقت ہے جس نے حساب کتاب اور نظم نہ ہونے کے باوجود ہمارے دینی اداروں کی حفاظت کی ہے اور انہیں فنا ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔

اس مقدس دینی ماحول میں مرحوم حاجی شیخ مرتضٰی انصاری جیسے مذہبی رہنما بھی پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے خود ان کے بقول اس طرح کے روپے کو کپڑے دھونے کے ٹب کا گندا پانی تصور کیا اور صرف انتہائی ضرورت میں اس سے بہت قلیل استفادہ کرتے رہے۔ دینی علوم کے طلبہ میں ہمیشہ ایسے افراد رہے ہیں اور اب بھی ہیں جو بے مثال زہد و قناعت اور بے نفسی سے زندگی گزارتے ہیں اور اپنے اساتذہ، رفقائے درس اور نزدیک ترین دوستوں تک کو اپنی غربت کی خبر نہیں ہونے دیتے۔ ایسے ہی لوگ اس آیتِ کریمہ کا مصداق ہیں۔

یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ

(نہ مانگنے کی وجہ سے) ناواقف انھیں ان کی عفت نفس کی بنا پر مالدار کہتے ہیں۔ [1]

باقاعدگی اور انتظام کی قدر و قیمت

ہمیں اعتراف ہے کہ کوئی چیز ایمان وتقویٰ کی جگہ نہیں لے سکتی اور یہ کہ ایمان و تقویٰ سے بہت سی خامیوں کی تلافی ہو جاتی ہے، لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ایمان وتقویٰ ہی سب کچھ ہیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز کا اپنا اثر اور نتیجہ ہوتا ہے اور اس سے اسی نتیجے کی توقع رکھنی چاہیے۔ نہ مادّی چیزیں غیر مادّی چیزوں کی جگہ پُر کر سکتی ہیں، نہ غیر مادّی چیزیں مادّی چیزوں کی۔ غیر مادّی چیزیں بھی پوری طرح ایک دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ مثلاً نہ ایمان، علم کی جگہ پُر کر سکتا ہے اور نہ علم، ایمان کی۔

نظم و ضبط اور انتظامی ادارے بھی انسانی زندگی میں ایک مقدّس اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ ایمان اور روحانیت نے بے نظمی کی بہت سی خرابیاں

---

[1] سورۃ البقرہ: ۲۷۳

دور کر دی ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بے نظمی اور علما کی معاش سے متعلق انتظامی اداروں کی عدم موجودگی نے بڑے پیمانے پر ایمان اور روحانیت کو مجروح کیا ہے اور ماحول میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ بعض بزرگ مجتہدین کے بیٹے، پوتے اور مصاحبین اس بے نظمی سے فائدہ اٹھا کر خمس کا روپیہ اس طرح اپنے تصرف میں لے آتے ہیں کہ برسوں خوب اللے تللے سے خرچ کرتے رہتے ہیں اور پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔

کبھی آپ نے سوچا کہ ان واقعات سے عالمِ روحانیت کو کس قدر نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے؟

ہمارے روحانی معاشرے کا ایک اور بڑا مسئلہ کچھ ایسے نام نہاد مقتدر علما کا وجود ہے جو کچھ خاص اداروں کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ انہی اداروں کی مدد سے انہیں طاقت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے اور یہی ادارے انہیں مالی امداد فراہم کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی چالاکی سے یا لالچ دے کر یا کسی اور طرح سے کچھ اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں اور پھر عملاً ہمیشہ ان اداروں کے مفاد میں اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔

میں نہیں چاہتا کہ ایسے پلید لوگوں اور ان کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کے بارے میں مزید بحث کروں۔ ہر شخص کم وبیش اس بات سے واقف ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ فساد کی جڑ کاٹنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ ہم اپنے روحانی اداروں کو باقاعدہ اور منظم بنائیں۔

وعظ وتبلیغ

علما سے متعلق اور ایک شعبہ وعظ وتبلیغ اور خطبہ ومنبر کا ہے۔ اس شعبے کے کیا فرائض ہیں، اس نے ماضی میں کیا خدمات انجام دی ہیں اور اب کیا خدمات انجام دے رہا ہے اور اس شعبے میں کیا نقائص اور خامیاں ہیں۔ اگر ان سب باتوں پر بحث کی جائے تو اس

کے لئے ایک جداگانہ مقالے کی ضرورت ہوگی۔ بہرحال جو نکات میں نے اب تک اٹھائے ہیں، ان کی مناسبت سے اس قدر کہوں گا کہ وعظ وتبلیغ کا شعبہ ایک اور طرح کی عوام زدگی میں مبتلا ہے۔ اس خامی کا تعلق سہمِ امام یا کسی اور مالی مد سے نہیں بلکہ اس بات سے ہے کہ اس کام نے باقاعدہ ایک پیشے اور کمائی کے ذریعے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ واعظ اجرت اور معاوضہ لے کر وعظ کہتے ہیں۔ یعنی ہمارے یہاں ٹھیک اس بات کا رواج ہو گیا ہے جس سے تمام انبیائے کرام نے جیسا کہ قرآنِ کریم میں متعدد جگہ آیا ہے، منع کیا ہے۔ چونکہ اس معاملے نے کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ طلب ورسد کے قانون کے مطابق وہی مال فروخت کے لئے پیش کیا جاتا ہے جس کی صارفین میں مانگ ہو۔

یہ بات کہ پیشہ ور واعظوں کا وعظ ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ہوتا ہے صرف اسی صورت میں تسلیم کی جاسکتی ہے جب یہ مان لیا جائے کہ سب تاجر بھی فقط وہی مال بازار میں لاتے ہیں جو گاہکوں کی مصلحت کے عین مطابق ہو۔

میں مانتا ہوں کہ اچھے اور صالح خطیب بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں اور انہوں نے گرانبہا خدمات انجام دی ہیں اور اب بھی انجام دے رہے ہیں۔ میں اس کا بھی قائل نہیں کہ موجود صورت یکلخت بدل دی جائے اور کوئی دوسرا طریقہ رائج کیا جائے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ خود ہمارا روحانی نظام خطیبوں اور واعظوں کی ایک جماعت کو صحیح خطوط پر تربیت دے اور وہی ان کی معاش کا انتظام کرے۔ یہ واعظ وعظ وتبلیغ کا کوئی معاوضہ نہ لیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنی فکری آزادی برقرار رکھ سکیں گے اور ان کا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کا وجود ہی اس کے لئے کافی ہوگا کہ دوسرے بھی ان کی پیروی کریں۔ اس وقت وعظ وتبلیغ کا شعبہ بھی ہمارے روحانی نظام کی طرح آزادیٔ رائے کی نعمت سے محروم ہے اور اسی لئے عوام کی جماعت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

انتباہ

اگر خدا کے فضل وکرم سے ہمارے روحانی نظام کے مالی مسائل حل ہو جائیں تو

اس سے دوسری خرابیاں بھی دور ہوجائیں گی۔ اگر ہم نے اس سلسلے میں کچھ نہ کیا تو پھر زمانہ خود کچھ کرے گے۔ ایک بات جو بڑی حوصلہ افزا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے علما کے سب طبقوں میں لائق، بزرگ، مخلص اور اصلاح پسند شخصیات موجود ہیں۔ درجہ اول کے مراجع تقلید اور اعلیٰ درجہ کے خطیبوں سے لے کر طلبہ اور عام واعظوں میں بھی ایسی شخصیتیں پائی جاتی ہیں۔

میں نے اس مقالے میں جو کچھ کہا ہے خدانخواستہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرے طبقات کے مقابلہ میں ہمارے علما میں کوئی کمی یا خرابی ہے بلکہ یہ مقالہ خود اس کی دلیل ہے کہ راقم الحروف کو ہر اصلاح کی توقع اسی سلسلۂ جلیلہ سے ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ روحانی نظام میں باقاعدگی پیدا کرنے سے لائق اور سر برآوردہ افراد کے لئے راہِ عمل کشادہ ہوجائے گی اور ان کے لئے اپنے مقدس مقاصد کو عملی جامہ پہنانا آسان ہوجائے گا۔

راقم الحروف کی نظر میں اس وقت تک جب تک کہ بنیادی اصلاح کی صورت پیدا نہ ہو، اصلاح پسند افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے کوئی ایسا پیشہ اور مشغلہ اختیار کرلیں جو نسبتاً کم وقت لے اور اپنی ذاتی محنت سے اپنی روزی کمانے کا بندوبست کریں تاکہ وہ آزادی کے ساتھ سوچ سکیں، آزادی سے اپنی بات کہہ سکیں، آزادی سے کسی اسلامی مورچے کا دفاع کرسکیں اور بنیادی اصلاح کے لئے راہ ہموار کرسکیں۔

ہمارے بڑے علما کو اس نکتہ پر توجہ دینی چاہئے کہ روحانیت اور اسلام کی بقا اسی میں مضمر ہے کہ جن دوررس واصلاحات کی ضرورت اس وقت محسوس کی جارہی ہے وہ ان اصلاحات کا نفاذ اپنے ہاتھ میں لیں۔ ان کا واسطہ ایسی قوم سے ہے جو اس وقت تو نیم بیدار ہے مگر روز بروز بیدار تر ہوتی جارہی ہے۔

اسلام اور علمائے اسلام سے موجودہ نسل کو جو توقعات ہیں، وہ ان توقعات سے مختلف ہیں جو گذشتہ نسل کو تھیں۔ ان خام اور نامعقول توقعات کا ذکر نہیں جو بعض لوگوں کو ہیں۔ اکثریت کی توقعات جائز اور بجا ہیں۔ اگر ہمارے علما جلد از جلد نہ جاگے، انہوں نے عوام کے پنجے سے اپنا گریبان نہ چھڑایا اور اپنی طاقتوں کو مجتمع کرکے وسیع النظری کے ساتھ

بروقت قدم نہ اٹھایا تو ان اصلاح پسندوں کی طرف سے جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، سخت خطرہ لاحق ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

آج یہ قوم اپنی خامیوں کی اصلاح کی ضرورت محسوس کرتی ہے، کل یہ اور زیادہ تشنگی محسوس کرے گی۔ اس قوم کو احساس ہو چکا ہے کہ یہ دوسری اقوام کی بہ نسبت پسماندہ ہے اور یہ چاہتی ہے کہ جلد ان کے برابر ہو جائے۔ اصلاح کے بہت سے مدعی جن کو دین سے تعلق اور دلچسپی نہیں گھات میں لگے ہوئے ہیں کہ نئی نسل کے بلند احساسات و جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ اگر اسلام اور علمائے اسلام نے قوم کی ضروریات، خواہشات اور جذبات پر مثبت ردِعمل کا اظہار نہ کیا تو وہ عصرِ جدید کے کسی نئے قبلہ کی سمت اپنا رخ موڑ لیں گے۔ غور کیجئے کہ اگر اصلاحات کے مورچے پر ایسے افراد کا قبضہ ہو گیا تو اسلام اور روحانیت کو کس قدر خطرہ لاحق ہو جائے گا؟

ہاں اگر یہ خواہش ہو کہ خدا کے فضل و کرم کے بھروسے پر دینی اداروں کی تنظیمِ نو کی جائے تو پھر مفکرین قوم کو مل بیٹھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ یہ کام کس بنیاد پر اور کس پروگرام کے تحت انجام دیا جائے۔ تعلیمی نصاب کیسے ترتیب دیا جائے، کس طرح کے ادارے قائم کئے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس سلسلے میں کچھ یادداشتیں مرتب کی ہیں لیکن میں اس مقالے میں ان کو اس لئے شامل نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں یہ مقالہ ضرورت سے زیادہ طویل نہ ہو جائے۔

امید اور انتظار

مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ ان خیالات اور خواہشات کو فضول اور ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں روحانی نظام کو منظم کرنا مُردے کو زندہ کرنے یا کم از کم ایسے بیمار کو اچھا کرنے کے مترادف ہے جس کی زندگی سے مایوسی ہو چکی ہو۔

لیکن میرا اپنا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں بنیادی طور پر دینی نظام کو زندہ ترین نظام سمجھتا ہوں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسے ان ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے

نجات دلائی جائے جو اس زندہ وفعال نظام کے ہاتھوں اور پیروں میں پڑی ہوئی ہیں۔

میں نے ہمیشہ کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ ہمارے روحانی نظام کی مثال اس مفید اور کارآمد درخت کی سی ہے جسے کیڑا لگ رہا ہو۔ ہمیں اس کی حفاظت کرنی چاہئے اور اس کا روگ دور کرنا چاہئے۔ جو لوگ اس درخت کو بوسیدہ اور ناکارہ سمجھتے ہیں ان کا خیال سو فیصد غلط اور گمراہ کن ہے اور اس کی بیخ کنی ضروری ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل ہوں کہ اسلام منہائے روحانیت کچھ نہیں۔ اگر اسلام سے روحانیت کو نکال دیا جائے تو وہ ایک سامراجی چیز بن کر رہ جائے گا۔ میرے نزدیک کوئی چیز ہمارے روحانی نظام کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اسلامی علوم کے اصل اور انمول ماہر علمائے دین ہی کے گروہ میں پائے جاتے ہیں۔ تنہا یہی وہ مقدس گروہ ہے جو تقویٰ، ایمان، اخلاص، جوش و جذبہ اور قربانی جیسے اوصاف سے متصف ہے اور یہی وہ اوصاف ہیں جن پر ہماری ملت کی بقا کا دار و مدار ہے۔

اسلامی علوم و معارف کا جو وسیع مطالعہ میں نے کیا ہے اور روحانیت سے وابستہ لائق شخصیات کے بارے میں جو مجھے معلومات ہیں ان کی بنا پر میرا عقیدہ ہے کہ نہ صرف اس نظام کی اصلاح واجب اور ضروری ہے بلکہ میری رائے میں یہ عملاً بھی کچھ بعید نہیں بلکہ مجھے امید ہے کہ یہ اصلاح عنقریب ضرور ہوگی۔

انهم يرونه بعيدا ونراه قريبا